ہفت روزہ

ندائے خلافت

لاہور

30 اپریل 2003ء - ۲۷ صفر المظفر ۱۴۲۴ھ

اشاعت خصوصی

عراق نمبر

جلد : 12 شمارہ : 14

بانی: افتدار احمد مرحوم

مدیر: حافظ عاکف سعید

آگ ہے، اولادِ ابراہیمؑ ہے، نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

دارالمطالعہ
APR 2003
ماڈل ٹاؤن

فہرست مضامین

اداریہ ________ 4

حصہ اوّل : عراق: قبل از اسلام ________ 5

دنیا کی قدیم ترین تہذیب...... اشوری فتوحات کی کہانی...... عراق کا قدیم تمدن...... مذہبی عقائد...... سرزمین انبیاء...... قدیم عراقی تہذیب کے اثرات

حصہ دوم : عراق: ورودِ اسلام سے سقوطِ بغداد تک ________ 15

جنگ قادسیہ...... جنگ نہاوند...... جنگ جمل...... جنگ صفین...... سانحۂ کربلا...... خلافت بنوعباس...... ابوجعفر منصور...... محمد مہدی...... موسیٰ ہادی...... ہارون الرشید...... امین الرشید...... مامون الرشید...... معتصم باللہ...... متوکل علی اللہ...... پہلے عروج کا زوال...... دینی علوم...... امام ابوحنیفہؒ...... امام مالکؒ...... امام شافعیؒ...... امام حنبلؒ...... امام بخاریؒ...... ابوالحسن اشعری...... سامانی حکومت...... بنی بویہ...... سلطنت فاطمیہ...... خلافت عباسیہ اور سلجوقی ترک...... صلیبی جنگیں...... خوارزم شاہی سلطنت...... سقوطِ بغداد

حصہ سوم : برطانوی تسلّط سے پہلی خلیجی جنگ تک ________ 31

خلافت عثمانیہ کا خاتمہ...... آزادی کے بعد...... کردستان...... شط العرب...... پہلی خلیجی جنگ...... ہمارا موقف کیا ہے؟

حصہ چہارم : خلیج کا فتنۂ عظیم ________ 38

ہم کیا سوچتے ہیں؟...... المیے کا اخلاقی جائزہ...... عربوں کی کثرتِ دولت کے نتائج...... پس پردہ اصل حقائق......

حصہ پنجم : جنگ جاری رہے گی! ________ 44

عہد صدامیہ کے خاص واقعات...... امریکہ نے حملہ کیوں کیا؟...... عظیم تر اسرائیل کا قیام...... تیل کے ذخائر پر قبضہ...... ڈالر اور یورو کی باہمی جنگ...... اب کس کی باری ہے؟...... بالآخر خاتمہ کیونکر ہوگا؟ ═══ **اس کے علاوہ** :

☆ خلافت عباسیہ: شہر بہ شہر علمی زندگی

☆ خلافت عباسیہ: 750تا1258ء

☆ خودساختہ خدا (نظم)

☆ سرزمین انبیاء واولیاء

☆ ہوش کرو (نظم) .... **اور بہت کچھ!**

قیامِ خلافت کا نقیب

ہفت روزہ　　　لاہور

ندائے خلافت

جلد 12　　شمارہ 14

24تا30اپریل2003ء

(۲۱تا۲۷صفر المظفر ۱۴۲۴ھ)

بانی: اقتدار احمد مرحوم

مدیر: حافظ عاکف سعید

نائب مدیر: فرقان دانش خان

ادارہ تحریر: سید قاسم محمود، مرزا ایوب بیگ
سردار اعوان، محمد یونس جنجوعہ

نگران طباعت: شیخ رحیم الدین

پبلشر: محمد سعید اسعد مختار، طابع: رشید احمد چوہدری

مطبع: مکتبہ جدید پریس، ریلوے روڈ، لاہور

مقام اشاعت: 36-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی:
67-گڑھی شاہو، علامہ اقبال روڈ لاہور

فون: 6316638-6366638 فیکس: 6305110

E-Mail:markaz@tanzeem.org

خصوصی شمارہ کی قیمت : 20روپے

سالانہ زرِتعاون

اندرونِ ملک......250روپے

بیرونِ پاکستان

☆یورپ، ایشیا، افریقہ وغیرہ
............1500روپے

☆امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ
............2200روپے

اداریہ

حافظ عاکف سعید

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عراق' امریکہ اور اسرائیل

بے شمار جلیل القدر صحابہ کرامؓ اور ان گنت اولیاء اللہ کا مدفن عراق آج امریکی و برطانوی افواج کے زیر تسلط ہے۔ دشتِ کربلا کو ایک بار پھر خون کے سیلاب کو نگلنے کا موقع ملا ہے۔ سقوطِ بغداد عراقی مزاحمت کے حوالے سے اونٹ کی کمر پر آخری تنکا ثابت ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے پورا عراق تیل کی بیش بہا دولت سمیت امریکہ کی جھولی میں جا گرا۔ اتحادی افواج کی سفاکانہ اور بے رحمانہ کارروائی کے نتیجے میں لاتعداد عمارتیں جن میں ہسپتال اور مارکیٹیں بھی شامل تھیں' ملبے کا ڈھیر بنیں اور ان میں رہنے بسنے والے ہزاروں بے گناہ شہری لقمہ اجل بنے۔ سینکڑوں معصوم بچے چیونٹیوں کی طرح مسل دیئے گئے' ہزارہا کو یتیمی کا داغ دیکھنا پڑا۔ اس تازہ ''یورشِ تاتار'' کے نتیجے میں ہلاک و زخمی ہونے والے عراقیوں کی صحیح تعداد شاید قیامت تک معلوم نہ ہو سکے کہ بقول جنرل ٹومی فرینک ''ہم لاشوں کو گنا نہیں کرتے''۔ یوں امریکی صدر بش جو عراقی عوام کو صدام کے جبر اور ظلم و ستم سے چھٹکارا دلانے کے ''نیک جذبے'' کے ساتھ عراق پر حملہ آور ہوا تھا' عراقی عوام کے حق میں ''مسیحا'' کے روپ میں ''تارا مسیح'' ثابت ہوا۔ سیدھی سی بات ہے کہ زبردست کا ٹھینگا سر پر ہوتا ہے اور جرم ضعیفی کی سزا ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے —— یعنی مرگِ مفاجات!

وقت کے اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں حضرت انسان کی قباچاک کئے جانے کا منظر چشم فلک سمیت اربوں انسانوں نے کھلی آنکھوں سے دیکھا۔ ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے ظاہر کی آنکھ سے تماشا کرنے والے اربوں انسانوں میں ایک ارب سے زائد وہ مسلمان بھی شامل تھے جو کرۂ ارض کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کی نگاہوں کے سامنے خوفناک امریکی اژدہا تاریخی اہمیت کے حامل ایک اسلامی ملک کو سموچا نگل گیا اور وہ ''ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم'' کی تصویر بنے رہے۔ یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالم پیری۔ اسے عالم اسلام کی بے بسی کہئے یا بے حسی' اور بدقسمتی کہئے یا بے توفیقی' کہ ایک ارب سے زائد تعداد رکھنے کے باوجود وہ امریکی بھیڑیئے کے مقابلے میں بھیڑ بکری ثابت ہوئے اور یہ دیکھنے کے باوجود بھی کہ امریکہ یکے بعد دیگرے اسلامی ممالک کو تر نوالہ بنانے پر تلا ہوا ہے' تاحال باہم متحد و متفق نہ ہو سکے —— اللہ کے دین سے بے وفائی اور اللہ کی کتاب سے بے اعتنائی کا انجام پوری امت کی ذلت و رسوائی اور انتشار و افتراق کی صورت میں آج ہمارے سامنے ہے۔

عراق پر غاصبانہ قبضہ کر کے امریکہ نے ایک تیر سے دو شکار کئے ہیں۔ تیل کے بیش بہا ذخائر پر قبضے کے ذریعے اپنی ڈوبتی معیشت کو سہارا دینا تو امریکہ کے پیش نظر تھا ہی' اصل اور اہم تر محرک ''گریٹر اسرائیل'' کے قیام کی راہ ہموار کرنا تھا کہ اسرائیل کے نزدیک عراق کی جنگی قوت کچل کر اسے آخری درجے میں غیر مسلح کرنا اس کے مذموم عزائم کے اعتبار سے ازبس ضروری تھا۔ قبل ازیں افغانستان کی طالبان حکومت کا خاتمہ اور وہاں موجود جہادی گروہوں کو کچلنے کی امریکی کوشش بھی اسی ناپاک ایجنڈے کا حصہ تھا۔ آئندہ شام' ایران اور پاکستان کی باری بھی اسی حوالے سے ہے —— یوں محسوس ہوتا ہے کہ امریکہ ساری دنیا سے دشمنی کا خطرہ مول لے کر اسرائیل اور یہودیوں کے مفادات کے تحفظ اور ان کے ناپاک ایجنڈے کی تکمیل کے لئے بھرپور طور پر سرگرم عمل ہے —— اس کا ایک سبب تو بالکل واضح ہے۔ ''فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے'' کے مصداق امریکی حکومت یہودی بینکاروں کے بے پناہ قرضے کے بوجھ تلے دب کر اس کے ہاتھوں بلیک میل ہونے پر مجبور ہے۔ امریکہ کی شہ رگ یہودیوں کے خون آشام پنجے کی گرفت میں ہے۔ بدقسمتی سے ایک دوسرا سبب اور بھی ہے جس نے اس معاملے کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔

صورت احوال کچھ یوں ہے کہ مذہبی حوالے سے اسرائیلی یہودیوں اور امریکی عیسائیوں بالخصوص New Born Christians کے مفادات اور مقاصد و عزائم میں حیرت انگیز اشتراک اور یک جہتی کی صورت بن گئی ہے۔ گریٹر اسرائیل کے قیام کو دونوں اپنا مذہبی فریضہ گردانتے ہیں۔ یہودیوں کے دین و مذہب کا تو یہ لازمی تقاضا ہے ہی' اور ہزار ہا برس کے بعد ملنے والے اس تاریخی موقع کو وہ کبھی ضائع کرنا نہیں چاہیں گے' پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی اکثریت کے نزدیک بھی گریٹر اسرائیل کا قیام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کہ اسی کے نتیجے میں حضرت مسیح علیہ السلام کا نزول ہوگا اور عالمی عیسائی ریاست کا قیام عمل میں آئے گا۔ امریکی صدر جارج ڈبلیو بش کے متعدد بیانات اس امر کی چغلی کھاتے ہیں کہ وہ خود کو اس معاملے میں مامور من اللہ سمجھتا ہے اور گریٹر اسرائیل کے قیام میں اسرائیل کی ہر قیمت پر مدد کرنا اپنا مذہبی فریضہ خیال کرتا ہے۔ مستقبل میں حالات کیا کروٹ لیں گے' اس بارے میں تو بہت کچھ قیاس آرائیاں کی جا سکتی ہیں لیکن مستقبل قریب میں امریکی پالیسی میں کسی تبدیلی کا امکان سردست نظر نہیں آتا۔

یوں تو عراق پچپن اسلامی ممالک میں سے ایک ملک ہے' لیکن تاریخ اسلام ہی نہیں انسانی تاریخ کے حوالے سے بھی اس کی خصوصی اہمیت ہے۔ بغداد' بصرہ' کوفہ اور کربلا اسلامی تاریخ کے اہم سنگ ہائے میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چوتھے خلیفہ راشد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں کوفہ کو دارالخلافہ بننے کا شرف حاصل ہوا۔ اس حوالے سے مناسب خیال کیا گیا کہ عراق پر ایک خصوصی نمبر شائع کیا جائے جس میں اس کی تاریخی و جغرافیائی اہمیت اور تاریخ اسلام میں اس کے مقام کو تفصیلاً واضح کیا جائے۔

سرزمین عراق اس وقت اسلام دشمن طاقتوں کے قبضے میں ہے۔ صحیح احادیث میں دی گئی خبروں کے مطابق قیامت سے قبل پورے روئے ارضی پر اسلام غالب ہو کر رہے گا۔ یہ پورا چمن جس کا نام کرۂ ارض ہے' بالآخر نغمۂ توحید سے معمور ہو کر رہے گا' لیکن ابھی کون کون سے دور فلک مسلمانوں پر آنے والے ہیں اور عراق کے بعد کون کون سے اسلامی ملک امریکی جارحیت کا نشانہ بننے والے ہیں' اس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ مسلم امہ نے اگر اب بھی اپنا قبلہ درست نہ کیا اور اللہ اور اس کے دین سے وفاداری کو اپنا شعار نہ بنایا تو مستقبل قریب میں حالات کے بدلنے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ oo

حصہ اوّل

عراق: قبل از اسلام

پتھر کے زمانے گزرنے کے بعد انسان نے اپنے دماغ سے کام لینا شروع کیا اور اس کی زندگی کے طور طریقے بدل گئے۔ شروع شروع میں تو یہ حال تھا کہ وہ جن جانوروں کا شکار کرنا چاہتے تھے انہیں ہاتھ سے پکڑنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اب انہیں پتھر پھینک کر جانوروں کو شکار کرنے کا طریقہ آ گیا۔ ایک اور کام کی بات معلوم ہوئی کہ بعض جانوروں کو ہلاؤ تو وہ ہل جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ جانور پالنے لگے۔ اب پتھروں سے اعلیٰ درجے کے اوزار بنائے جانے لگے۔ زراعت اور کھیتی باڑی کے طریقے شروع ہوئے جس کے لئے زمین کا زرخیز ہونا بڑا ضروری ہے یعنی زمین ایسی ہونی چاہئے کہ تھوڑی سی محنت سے اس میں خوب فصل ہو سکے۔ ایشیا اور شمالی افریقہ کی دریائی وادیوں کی مٹی ان علاقوں کے دوسرے حصوں سے زیادہ زرخیز ہے اس لئے انسان ان دریاؤں کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ آباد ہو کر بستیاں اور سماج بنانے لگا۔ یہ بستیاں اور سماج انسانی تاریخ میں ''تہذیب'' کے عنوان سے موسوم ہوئے۔ قدیم تہذیبیں دریائی تھیں جو تعداد میں چار ہیں:

(1) وادیٔ دجلہ و فرات کی تہذیب (عراق)
(2) وادیٔ نیل کی تہذیب (مصر)
(3) وادیٔ سندھ کی تہذیب (پاکستان)
(4) وادیٔ زرد کی تہذیب (چین)

دنیا کی قدیم ترین تہذیب

نصف صدی پہلے تک اقوامِ عالم کی کوئی بھی تاریخ اپنا پہلا باب وادیٔ نیل کی مصری قوم پر کھولتی تھی اور ہمارے پاکستان میں تو قدامت کے لحاظ سے یونان و روم ہی کو پہلا درجہ دیا جاتا رہا ہے حالانکہ دریائے زرد کا چین اور دریائے سندھ کا پاکستان یونان و روم سے بہت پہلے کی تہذیبیں ہیں۔ مورخین میں عام طور پر مصری تہذیب کو قدیم ترین اور اولین خیال کیا جاتا رہا ہے لیکن جدید اثریاتی کھدائیوں سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ وادیٔ دجلہ و فرات کی تہذیب مصری تہذیب سے کہیں قدیم اور پرانی ہے۔ عراق میں سومیری تہذیب کا آغاز آج سے تقریباً سات ہزار سال قبل (یعنی 5000 قبل مسیح) میں ہو چکا تھا جبکہ مصری تہذیب کے آثار 3400 ق م سے پہلے کے نہیں ملتے۔ عراقی تہذیب 5000 ق م سے شروع ہو کر بابل پر سائرس اعظم کے قبضے یعنی 539 ق م تک عروج و زوال کے قدرتی مراحل سے گزرتے ہوئے تقریباً چار ساڑھے چار ہزار سال تک جاری و ساری رہی۔ آپ عراقی تہذیب کے عرصۂ حیات کا شماریوں کیجئے کہ ہماری اسلامی تاریخ کو ابھی تقریباً ڈیڑھ ہزار سال ہوئے ہیں جبکہ ابتدائی عراقی تہذیب مسلسل چار ہزار سال تک قائم رہی۔

وادیٔ دجلہ و فرات کا موجودہ نام عراق ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک اسے میسوپوٹیمیا کہتے تھے یعنی دو دریاؤں کی سرزمین۔ دوآبہ بھی کہتے تھے۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس وقت اس کا نام عراق تھا نہ میسوپوٹیمیا۔ اس وادی کا کوئی نام نہ تھا بلکہ پورا علاقہ تین حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ شمالی حصہ (موجودہ موصل کا علاقہ) جس میں انسانی آبادی کے سب سے قدیم آثار ملے ہیں اشور کہلاتا تھا۔ وسطی علاقے کا نام (جہاں اب بغداد آباد ہے) عکاد تھا اور جنوبی عراق کا ڈیلٹا سومیر کہلاتا تھا۔

عراق دراصل دجلہ و فرات کا قدرتی عطیہ ہے۔ وہاں کے باشندوں کی زندگی کا انحصار ان دریاؤں پر ہے۔ اگر یہ دریا خشک ہو جائیں تو عراق ویران و ریگستان ہو جائے۔ دریائے فرات شمال میں کوہ ارارات سے نکلتا ہے (یہ وہی پہاڑ ہے جس پر روایت کے مطابق سیلاب کے بعد حضرت نوح ؑ کی کشتی جا کر ٹھہری تھی) اور ملک شام میں سے گزرتا ہوا شمال مشرق کی سمت سے عراق میں داخل ہو جاتا ہے اور میدان میں کئی سو میل کا سفر طے کر کے بالآخر مقام قرنہ کے قریب اس میں دریائے دجلہ آ ملتا ہے جہاں یہ دونوں دریا مل کر شط العرب کہلاتے ہیں۔ دریائے فرات کی لمبائی 1780 میل ہے۔ اس دریا کے کنارے کئی تہذیبوں کے آفتاب طلوع و غروب ہوئے۔ اس نے بابل، نینوا، کلدانی اور شامی تہذیبیں دیکھیں۔ اسی کے کنارے سکندر اعظم نے دم توڑا، امام حسینؓ اور اہلِ بیت کے ساتھ سانحۂ جاں گسل پیش آیا۔ خلافت عباسیہ نے یہیں عروج پایا اور یہیں زوال دیکھا۔

دریائے دجلہ کی لمبائی 1150 میل ہے۔ کردستان کی پہاڑیوں سے نکل کر عراق کے میدان کو سیراب کرتا ہوا، راستے میں دریائے زاب کلاں، زاب خورد اور دریائے دیالہ کو اپنی آغوش میں لیتا ہوا بصرہ سے 60 میل شمال میں قرنہ کے مقام پر دریائے فرات میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے کنارے بغداد، سامرا، موصل اور قط العمارہ کے شہر آباد ہیں۔

وادیٔ دجلہ و فرات میں، زمانۂ قدیم میں ایسی بڑی بڑی تہذیبیں رائج رہی ہیں، جو تاریخ کے اوراق پر اپنے انمٹ نقوش ثبت کر گئی ہیں۔ عراق کے ان تاریخ ساز انسانی گروہوں کی چھوڑی ہوئی تحریریں اور کتبے مل چکے ہیں۔ جن مذہب و متمدن اور سیاسی لحاظ سے مقتدر قدیم اقوام کا وجود عراق میں ثابت ہے، ان میں زیادہ مشہور یہ ہیں:

(1) سومیری (3400 تا 2000 ق م)
(2) عکادی (2334 تا 2154 ق م)
(3) بابلی (1894 تا 1595 ق م)
(4) اشوری (2000 تا 1595 ق م)
(5) کسدی (1595 تا 1157 ق م)
(6) کلدانی (625 تا 539 ق م)

ان اقوام کے ساتھ ساتھ عراق کے آس پاس کے علاقوں میں دوسری اقوام کی تہذیب کا بھی عروج تھا، مثلاً حلی، فونیقی، آرمنی، سیتھیائی، فرجیائی وغیرہ۔ تقریباً ایک سو سال پہلے تک ان اقوام کے بارے میں انسان کو معلوم تک نہ تھا کہ یہ بھی کبھی کسی ملک میں آباد و شاد کام رہی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر آخر ہزاروں سال پہلے کی ان قدیم اقوام کے بارے میں انسان کو معلومات اور وہ بھی

صدقہ' کیسے معلوم ہوئیں؟ یہ اپنی جگہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔ جدید سائنس نے افلاک کی فتح' چاند کی تسخیر' مریخ کی سیر اور دیگر سیاروں کے خلائی سفروں کی حکایتیں تو مزے لے لے کر بیان کی ہیں' جن کے ہر زبان کی کتابوں میں بڑے چرچے ہیں' لیکن زمین کے بطون میں بہت نیچے گہرائیوں میں جا کر بیش قیمت انسانی میراث اور آثار حیاتیہ کے جو خزینے انسان نے دریافت کئے ہیں ان کی تشہیر بہت کم ہوئی ہے اور اکثر فتوحات پر لٹریچر کم لکھا گیا ہے۔

اثری فتوحات کی کہانی

عراق کی سرزمین میں مدفون قدیم اقوام کی تلاش و دریافت کا کام اپنے کسی مسلمان یا عرب یا مشرقی بھائی نے انجام نہیں دیا۔ یہ لوگ ماتحت عہدوں پر رہ کر مددگار رہے ہوں تو بات دوسری ہے۔ اس سارے کام کا سہرا جو تقریباً دو صدیوں پر پھیلا ہوا ہے' اہلِ مغرب کے سر ہے' جن میں عیسائی اور یہودی دونوں شامل ہیں۔ پہلا یورپی سیاح جس نے یہ شبہ ظاہر کیا تھا کہ عراق کے ریگستانوں کے ٹیلوں میں قدیم شہر دبے پڑے ہیں' ایک شخص کلاڈیس جیمز رچ تھا۔ اس نے 1811ء میں جبکہ وہ عراق میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا نمائندہ تھا' پوری وادی کا سفر اور ٹیلوں کا معائنہ کیا اور ان کے خاکے بنائے۔ وہ بغداد سے کوئی 25 میل جنوب میں ایک ٹیلے پر گیا جو بابل کے نام سے موسوم تھا۔ وہاں اسے چند ایسی اینٹیں ملیں' جن پر ایک نامعلوم رسم الخط میں تحریریں درج تھیں۔ خرابی صحت کی وجہ سے وہ کھدائی کرنے کے قابل تو نہ تھا لیکن اس نے ایک کتاب ''آثارِ بابل'' کے نام سے شائع کردی۔

سارگون دوم کا گرمائی محل

پال ایمائل بوتا ایک اور سیاح تھا۔ اس نے جیمز رچ کی کتاب پڑھی تو قدیم اقوام کے خواب دیکھنے لگا۔ وہ عراق میں سائنسی تحقیق کی غرض سے نکلا۔ خوش قسمتی سے اسے شہر موصل میں فرانسیسی قونصل کی تعیناتی مل گئی۔ اگرچہ وہ ماہر اثریات نہ تھا' مگر اسے سائنسی تجربے کرنے کا شوق تھا۔ وہ گرم آب و ہوا کا عادی تھا اور مقامی عربی زبان بول سکتا تھا۔ اس نے اپنے ذاتی شوق سے چند کارندوں کو ساتھ ملا کر وادی کے مختلف ٹیلوں پر کھدائی شروع کی' لیکن چنداں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ بالآخر مارچ 1843ء میں اس نے خورس آباد میں کھدائی کا کام شروع کرایا۔ ابھی کھدائی شروع ہی ہوئی تھی کہ انہیں چونے کے پتھر کی دو دیواریں ملیں جو کتبوں اور پتھر کے کام سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ کندہ نقوش میں لمبی ڈاڑھیوں والے آدمی' عظیم الجثہ خوفناک جانور اور برسرِ پیکار سپاہی دکھائے گئے تھے۔ دیواروں پر عجب قسم کی پیکانی تحریر درج تھی۔ اینٹوں پر بھی اسی رسم الخط میں کچھ لکھا ہوا تھا۔

پال بوتا نے شکستہ اینٹوں اور پتھروں کو ہٹایا تو ایک پُرشکوہ عمارت کھل کر سامنے آ گئی' جس میں وسیع صحن تھا۔ بڑے بڑے دروازے تھے اور ان پر سنگ تراشی کے کام کی بھرمار تھی۔ ان پر اشوری تہذیب کی زندگی کی تصویری جھلکیاں تھیں' لیکن چونے کا پتھر بھربھرا تھا' اور جب ان پر سے مٹی ہٹائی جاتی تھی تو وہ بہت جلدی ٹوٹ جاتے تھے۔ فرانس سے فوری طور پر ایک مصور کو بلایا گیا تاکہ اس سے پہلے کہ اس کی دریافتیں ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جائیں' ان کے خاکے بنوالئے جائیں۔ خورس آباد میں جو چیز دریافت ہوئی تھی' وہ اشوریہ کے بادشاہ سارگون دوم کا گرمائی محل تھا جو 709ق م میں تعمیر ہوا تھا۔

اشور نصر پال کا محل

1842ء میں ایک اور سیاح ہنری لیارڈ نے موصل کے قریب ''نمرود'' نامی ایک ٹیلے پر بدو قبیلے کے چھ مزدوروں کو اجرتی ملازم رکھ کر کھدائی شروع کرائی۔ پہلی کھدائی سے سیل کھری کی دس سلیں برآمد ہوئیں۔ یہ کسی محل کی اندرونی دیواروں پر آرائش کے لئے استعمال میں آنے والی سلیں لگتی تھیں۔ یوں لگتا تھا' جیسے محل کو نذرِ آتش کیا گیا ہو' کیونکہ سلیں چٹخی ہوئی تھیں اور جونہی انہیں چھوا گیا وہ ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی تھیں۔ لیارڈ نے پہلے ہی دن دو اشوری محل دریافت کر لئے تھے۔ لیارڈ نے جو محل نمرود کے ٹیلے سے کھود کر نکالا تھا' وہ دراصل اشور کے بادشاہ اشور نصر پال دوم کا محل تھا جس نے 885 تا 859ق م عراق پر حکمرانی کی تھی۔

نینوا کی دریافت

بعض دوسرے ماہرین اثریات نینوا میں کام کرنے پہنچے۔ یہ وہ شہر تھا جس کو پال بوتا نے خورس آباد کے قریب ہی دریافت کر لیا تھا۔ جلد ہی اُن وحشت خیز اشوری بادشاہوں کے متعلق بہت کچھ معلوم ہو گیا تھا' جنہوں نے اپنی بدکاریوں اور جبر و تشدد کے دستاویزی ثبوت پیکانی خط میں تحریر کر کے آئندہ نسلوں کی عبرت کے لئے محفوظ رکھ چھوڑے تھے۔ نینوا میں سینا حرب اور اشوربنی پال جیسے خون کے پیاسے بادشاہوں کی حکمرانی تھی۔ یہ ایسے وحشی تھے جنہوں نے کوئی بھی ایسی چیز تخلیق یا ایجاد نہیں کی جو ان کی اپنی کہلائے۔ حتیٰ کہ انہوں نے اپنے فن اور اپنی زبان بھی جنوب میں بسنے والے اہلِ بابل سے چرائی تھی۔ انہوں نے اردگرد کے تمام علاقے لوٹ مار اور تباہی و بربادی پھیلانے کے بعد فتح کر لئے تھے۔ جب سینا حرب نے بابل کو فتح کیا تو اس نے وہاں اپنی فتوحات کے بارے میں فخریہ انداز میں الواح پر تحریر کرایا تھا:

''میں نے شہر اور اس کے مکانات' بنیادیں اور دیواریں تک تباہ کرا دیں۔ میں نے سب کو آگ لگوا دی۔ شہر کی فصیل' معبد اور دیوتا اور معبدوں کے مینار' وہاں جو کچھ بھی تھا میں نے سب کو اٹھوا کر نہر اراحتو میں غرق کرا دیا۔ میں نے یہاں اتنی زبردست تباہی پھیلائی کہ آنے والے مستقبل میں کسی کو اس شہر کی جائے وقوع اور یہاں کے معبد دیوتا کے نام بھی یاد نہیں رہیں گے۔ میں نے شہر کے بیچوں بیچ نہریں کھودا کر' ان میں پانی چھوڑ کر سیلاب برپا کر دیا ہے تاکہ بچی کھچی بنیادیں بھی باقی نہ رہیں۔ میں نے پانی کے ریلوں سے اس شہر کو صفحۂ ہستی سے نابود کر کے ایک عام چراگاہ بنا دیا۔ میں نے یہاں کی زمین اکھاڑی اور فرات میں بہا کر سمندر کے حوالے کر دی۔''

بابل کی دریافت

ڈھائی ہزار سال پہلے مشہور یونانی مورخ ہیروڈوٹس نے اپنی تاریخ میں شہر بابل کا ذکر ان الفاظ میں کیا تھا:

''اپنی وسعت کے لحاظ سے بابل دنیا کے کسی بھی شہر سے زیادہ پُرشکوہ ہے۔ شہر کی دیوار عظیم (فصیل) کا محیط تقریباً 56 میل ہے۔ یہ 50 کیوبیٹس (80 فٹ) چوڑی اور 200 کیوبیٹس (320 فٹ) اونچی ہے۔ اس دیوہیکل دیوار میں تانبے کے سو دروازے جڑے گئے ہیں۔ یہ بیرونی قلعہ بندی ہے۔ اندر کی جانب ایک اور دیوار ہے جو اتنی چوڑی تو نہیں لیکن مضبوطی میں اس سے کم نہیں ہے۔ شہر دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک میں بے حد مضبوط دیواروں سے گھرا ہوا شاہی محل ہے۔ دوسرے میں بابلی زیوس بل کا معبد ہے۔''

جب ڈاکٹر رابرٹ نے 2 اپریل 1899ء کو کھدائی کا کام شروع کرایا تو ہیروڈوٹس کی رائے اس کے ذہن میں تھی۔ دو ہفتے بعد 15 اپریل کو اسے بابل کی عظیم دیوار (فصیل) مل گئی تھی۔ اس نے ٹنوں مٹی کا ملبہ ہٹوایا اور 2204 فٹ لمبی ایک دیوار نمایاں نکلی۔ اس سے تقریباً 38 فٹ باہر کی جانب 25 فٹ موٹی ایک اور دیوار تھی اور پھر ایک خندق تھی' جس کے پار 12 فٹ چوڑی دیوار مزید تھی۔ اندرونی دو دیواروں کی درمیانی جگہ کوڑے کرکٹ سے پاٹ دی گئی تھی' تاکہ دیوار کے اوپر اتنا چوڑا راستہ بن جائے جس پر چار چار گھوڑوں کی دو دو قطاریں علیحدہ علیحدہ ایک دوسرے کے قریب سے گزر سکیں۔ اندرونی دیوار کے ساتھ ساتھ ہر 165 فٹ کے فاصلے پر ایک 27 فٹ اونچا حفاظتی مینار تھا۔ ایسے کُل 360 مینار تھے۔ گویا بابل دنیائے قدیم کا ایسا شہر تھا جس کے حفاظتی اقدامات سب سے مستحکم اور ٹھوس تھے۔ جب سقوطِ بابل ہوا تو اس لئے نہیں کہ

دیواریں توڑ دی گئی تھیں بلکہ اس لئے کہ شہر کے اندر غداروں نے اہلِ فارس کو اندر بلا لینے کی سازش کی تھی۔

شاہراہ بابل

اگلے مرحلے میں ڈاکٹر رابرٹ نے ایک عظیم الشان شاہراہ کھود نکالی جو شہر کے مرکز سے گزرتی ہوئی شمال سے جنوب کی سمت جاتی تھی اور جس پر جلوس نکالے جاتے تھے۔ یہ شاہراہ 73 فٹ چوڑی تھی' اور اتنی چوڑی اور شاندار سڑک شاید ہی کبھی قدیم یا جدید دنیا میں بنائی گئی ہو۔ اس کے دونوں کناروں پر موٹی موٹی 23 اونچی دیواریں تھیں جو نہایت چمکدار' رنگین اور روغنی اینٹوں سے مزین تھیں۔ یہ شاہراہ بابل کے بادشاہ بخت نصر نے بنوائی تھی۔ اس شاہراہ پر سے بابل کے عظیم المرتبت دیوتا مردوک کے پروہتوں کا جلوس گزرتا تھا۔ پروہت قربانی کے جانور تھامے آگے بڑھتے تھے۔ ڈھول بجتے تھے اور نفیریاں گیت گاتی تھیں' جبکہ ہزاروں پجاری پیچھے پیچھے چلتے تھے۔

بابِ عشتار

شاہراہ بابل باب عشتار تک جاتی تھی۔ عشتار اہل بابل کی سب سے بڑی دیوی تھی۔ اس کے نام سے موسوم دروازہ بھی عظیم الشان تھا۔ آج بھی یہ دروازہ موجود ہے اور چالیس فٹ اونچا ہے۔ یہ دوہرا دروازہ تھا جس کی آرائش سینکڑوں چمکدار اور رنگین سانڈوں اور دیگر جانوروں کے نقوش سے کی گئی تھی۔ آج باب عشتار تک جاتی ہوئی ''راہ مقدس'' کی زبردست چڑھائی چڑھتے ہوئے سانس پھول جاتا ہے۔

مینار بابل

بائبل میں مینار بابل کے متعلق بتایا گیا ہے کہ جری اور بہادر جوانوں نے اسے اس قدر بلند بنایا تھا کہ یہ تختِ خداوندی تک پہنچ گیا تھا۔ عراق کے ہر شہر میں ایک مینار ہوتا تھا جو منزل وار بلند ہوتا جاتا تھا۔ یہ مینار شہر کا مقدس ترین مقام تھا۔ یہ ایک بہت بڑے احاطے میں واقع تھا جس کے گرداگرد چھوٹے چھوٹے معبد تھے۔ سب سے اونچی عبادت گاہ مردوک دیوتا کے لئے مختص تھی۔ عبادت گاہ کی دیواروں پر سونے کی پتریاں اور نیلی روغنی اینٹیں جڑی گئی تھیں۔ جب دھوپ مینار کی چوٹی پر پڑتی تو پورا بابل منعکس ہونے والی روشنی سے جگمگا اٹھتا۔

اشوری بادشاہ سینا حرب نے مینار کو تباہ کر دیا تھا' لیکن بخت نصر نے اسے پہلے سے زیادہ پُرشکوہ انداز میں از سرِ نو تعمیر کرایا تھا۔ اہلِ فارس نے 562 ق م میں سائرس اعظم کی زیرِ کمان جب بابل کو فتح کیا تو انہوں نے مینار کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ سائرس اُس کی عظمت سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس نے اپنا مقبرہ بھی اسی قسم کے مینار جیسا بنانے کا حکم دیا' لیکن بعد کے ایک ایرانی بادشاہ زرکسیز نے بابل کی ایک بغاوت کچلنے کے دوران مینار کو مٹی کا ڈھیر بنا دیا تھا۔ اس کے بعد جب سکندر اعظم ہندوستان کی جانب رواں دواں تھا تو وہ بابل سے گزرا اور اُس نے دس ہزار آدمیوں کو دو ماہ کے لئے کام میں جوت دیا' تا کہ ملبہ ہٹائیں اور مینار کی کچھ نہ کچھ عظمت پھر سے بحال کریں۔

بابل کے معلق باغات

ایک عظیم دیوار' ایک شاہراہ' ایک دروازہ' ایک مینار۔ یہ تھیں ڈاکٹر رابرٹ کی شاندار دریافتیں۔ پانچویں یادگار تھی ایک باغ' یعنی بابل کے معلق باغات' دنیا کے سات عجائبات میں سے ایک۔ ڈاکٹر رابرٹ کو کھدائی کے دوران ایک عجیب سا کنواں ملا' جس میں تین مالیں تھیں' اور ایک لمبی سی مال دو چوکور مالوں پر دھری تھی۔ معائنے کے بعد ڈاکٹر موصوف نے نتیجہ اخذ کیا کہ اس کنوئیں میں کبھی ایک ''زنجیری نلکا'' رہا ہوگا اور اس زنجیر میں بالٹیاں ہوں گی جو نیچے سے پانی لاتی ہوں گی اور پھر اسے عمارت کی چھت تک پہنچاتی ہوں گی۔ مشین تو بلاشبہ کبھی کی نیست و نابود ہو چکی تھی' مگر نمونہ واضح تھا۔

بے شک باغات معلق یعنی لٹکے ہوئے نہیں تھے۔ دراصل وہ گلیوں سے بہت اونچائی پر چھتوں کے اُوپر لگائے گئے باغات تھے۔ نیچے سے لوگ ان کو دیکھتے تھے تو وہ لٹکے ہوئے نظر آتے تھے۔ بابل کے بادشاہ بخت نصر نے یہ باغات اپنی نوجوان بیوی کی تفریحِ طبع کے لئے بنوائے تھے' جو میدیا کی شہزادی تھی۔ میدیا اپنے پھلوں اور پھولوں کے لئے مشہور تھا اور بابل میں' جہاں بارش نہیں ہوتی تھی' شہزادی کو ہری بھری زرخیز پہاڑیوں کی یاد ستاتی تھی۔ چنانچہ بخت نصر نے محل کی زمین میں منڈیروں کا ایک سلسلہ تعمیر کروایا تھا جو منزل بہ منزل 350 فٹ بلندی تک چلا جاتا تھا' گویا آج کل کی تیس منزلہ سر بہ فلک عمارت کے برابر۔ پمپوں کے ایک حیرت انگیز نظام آبِ رسانی کے تحت دریائے فرات سے پانی ان باغات کو سرسبز و شاداب رکھنے کے لئے لایا جاتا تھا۔ جہاں اپنے دُور افتادہ میدیا کی یاد تازہ کرنے کے لئے شہزادی لمبے لمبے دن کاٹا کرتی تھی۔

ماہرین اثریات کو عراق میں اب تک درجنوں قدیم شہروں کے سراغ مل چکے ہیں' جن میں اشور' نینوا' نمرود' نپور اور بابل کے علاوہ اُر بھی شامل ہے جو حضرت ابراہیمؑ کی جائے ولادت ہے۔

عراق کا قدیم تمدن

عراق کا تمدن' انسان کا پہلا پہلا تمدن تھا۔ وہ حیوانیت اور جسمانیت کی منزل عبور کر کے انسانیت اور عقل کے مرحلے میں تازہ تازہ داخل ہوئے تھے۔ اس کے باوجود

عراق

قومی نام: جمہوریہ العراق

دارالحکومت: بغداد

صدر: صدام حسین (از 1979ء)

رقبہ: 168,753 مربع میل

(437,072 مربع کلومیٹر)

آبادی: دو کروڑ چالیس لاکھ (تقریباً)

شرح افزائش: 2.8 فی صد

گنجانی: 142 افراد فی مربع میل

اہم شہر مع آبادی:

بغداد: (48 لاکھ)

موصل: (7 لاکھ)

اربیل: (5 لاکھ)

کرکوک: (4 لاکھ)

بصرہ: (4 لاکھ)

کرنسی: عراقی دینار

زبانیں: عربی' کردی

نسلیں: عرب (75 تا 80 فی صد)' کرد (15 تا 20 فی صد)' ترکمان' اشوری اور دیگر (5 فی صد)

مذاہب: مسلمان 97 فی صد (شیعہ 60 فی صد' سنی 37 فی صد)' عیسائی اور دیگر 3 فی صد

شرح خواندگی: 60 فی صد

مجموعی قومی پیداوار: 57 ارب ڈالر

فی کس آمدنی: 2500 ڈالر سالانہ

افراطِ زر: 100 فی صد

قابل کاشت رقبہ: 12 فی صد

زراعت: گندم' جو' چاول' سبزیاں' کھجور' پھل' کپاس' مویشی' بھیڑ' بکریاں

قدرتی وسائل: پٹرول' قدرتی گیس' فاسفیٹ' گندھک

برآمدات: 22 ارب ڈالر (خام تیل)

درآمدات: 14 ارب ڈالر (خوراک' ادویہ' مصنوعات)

اہم تجارتی ساتھی: روس' فرانس' سوئٹزرلینڈ' چین' مصر' ویت نام' اردن' ترکی

ان کی قوتِ ایجاد و تخلیق کا یہ حال تھا کہ محنت' جفاکشی' جدت طرازی اور مہم جوئی اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ اعلیٰ درجے کے صناع اور حرفہ کار فنِ تعمیر کے ماہر اور موجد تھے۔ بہترین سنگ تراش اور مجسمہ ساز تھے۔ پیکر تراشی کو انہوں نے بلند مقام پر پہنچا دیا۔ انہوں نے کمہار کا چاک' گاڑی کا پہیہ' ہَل' بادبانی کشتی' محراب' ڈاٹ اور گنبد ایجاد کئے۔ جواہر تراشی' دھاتوں میں ٹانکا لگانا' جھالنا' جڑاؤ' کندہ کاری اور مرصع کاری بھی انہوں نے ہی شروع کی۔ سومیر میں تعمیراتی سامان ناپید تھا۔ اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ دوسرے ملکوں سے عمارتی پتھر اور عمارتی لکڑی درآمد کی۔ اینٹیں بجانے کا سانچا ایجاد کر کے اینٹیں بنانے لگے اور انہیں آگ پر پکانے کا طریقہ بھی وضع کر لیا' اور یوں انہوں نے رہائش کا مسئلہ حل کر لیا۔

سب سے بڑی صنعت ٹیکسٹائل یعنی پارچہ بافی کی تھی۔ تجارتی لحاظ سے بھی سب سے اہم صنعت یہی تھی۔ صرف شہر اُر میں ہر سال ہزاروں ٹن اُون سے کپڑے بنائے جاتے تھے اور اُون حاصل کرنے کے لئے بکریاں' بھیڑیں بھینسے بے شمار تعداد میں پالے جاتے تھے۔

جنوبی عراق کے سب سے پہلے آباد کاروں کو بھی مصنوعی آبپاشی کا خیال سوجھ گیا تھا۔ چنانچہ وہ عراق کے دونوں دریاؤں دجلہ و فرات کے حاصل خیز سیلابی پانی کو جمع کر کے اس سے اپنے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کیا کرتے تھے۔ اس علاقے میں معدنیات اور پتھر موجود نہیں تھے کہ وہ اپنی عمارتوں اور گھروں کی تعمیر کے کام میں لاتے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے انہوں نے چکنی مٹی اور گارے سے مختلف قسم کے برتن وغیرہ بنا کر انہیں آوے میں پکانا سیکھ لیا۔ عمارتی لکڑی کی نایابی کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ دلدلوں میں اُگنے والے بڑے بڑے اور کثیر تعداد میں سرکنڈے کاٹ کر انہیں سکھا لیتے۔ انہی سے اپنی جھونپڑیاں وغیرہ بناتے اور اُن پر گارے کی لپائی کر لیتے۔

اہلِ عراق بہت بڑے تاجر تھے۔ ان کے تجارتی بحری جہاز دُور دُور تک جاتے تھے اور دوسرے ملکوں سے سمندری تجارت کے ساتھ ساتھ خشکی کے راستے بھی ان کی تجارت برابر جاری تھی۔ برصغیر' مصر' عرب' ایران' ترکستان' ترکی اور دوسرے خطوں کے ساتھ ان کے گہرے تجارتی روابط تھے بلکہ وہ تھائی لینڈ تک تجارت کر رہے تھے اور وہاں سے ٹن منگواتے تھے۔ وہ تانبا اومان سے' لاجورد بدخشاں سے' کپاس برصغیر سے اور موتی وغیرہ بحرین سے حاصل کرتے تھے۔ موتی کو وہ چشم ماہی (مچھلی کی آنکھ) کہتے تھے۔ وہ بیرونی ممالک سے دھاتیں' پتھر' لکڑی اور اپنی ضرورت کی دوسری تمام اشیاء اور خام مال منگواتے اور پھر ان سے مصنوعات تیار کر کے دوسرے ملکوں کو برآمد کر دیتے۔ گویا عراق پانچ ہزار سال پہلے کا جاپان تھا۔ انہوں نے تجارت و صنعت سے خوب دولت کمائی اور اپنے ملک کو مالا مال کر دیا۔ ملک میں قدرتی وسائل اور سہولتوں کے فقدان کے باوجود انہوں نے اپنی محنت' جدت اور حیرت انگیز تخلیقی صلاحیت کے بل پر عراق کو صحیح معنی میں باغِ عدن (بائبل کی جنت) بنا کر رکھ دیا۔ اپنی تہذیب و تمدن کو بے حد ترقی دی۔ بڑے بڑے شہر آباد کئے۔ تین ہزار قبل مسیح تک ان کا تمدن مشرق میں برصغیر' مغرب میں بحیرۂ روم' جنوب میں حبشہ اور شمال میں بحیرۂ کیسپین تک پہنچ گیا۔

انہوں نے زراعت کے لئے مصنوعی آبپاشی کا بہت شاندار نظام قائم کر رکھا تھا۔ چنانچہ وہ نہ صرف اپنی ضرورت کے مطابق بلکہ فاضل اناج بآسانی پیدا کر لیتے تھے۔ وہ مختلف اناج کاشت کرتے تھے۔ ان میں گندم' جو اور باجرہ وغیرہ شامل تھے۔ طرح طرح کی سبزیاں پیدا کی جاتی تھیں۔ کھجور سے وہ ایک سیال مادہ نکالتے جسے وہ شہد کہتے تھے۔ کھجور کی مادہ میں پیوندکاری سے وہ بخوبی آگاہ تھے اور اس کی پیوندکاری کرتے رہتے تھے۔ کوئی چار ہزار سال پہلے کی ایک فہرست نباتات دستیاب ہوئی ہے' جس میں انہوں نے کھجور کی مختلف اقسام اور اس درخت کے مختلف حصوں کے کوئی ڈیڑھ سو نام بتائے ہیں۔

شہری ریاستیں

قدیم عراق شہری ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ سارا ملک سیاسی لحاظ سے سارگون اول کے ذریعے ہی متحد ہوا تھا۔ شہری ریاست ایک بڑے شہر اور اس کے مضافات' دیہات و قصبوں' باغوں' تاکستانوں' نخلستانوں اور کھیتوں پر مشتمل ایک مخصوص رقبے کی حامل ہوتی تھی۔ شہری ریاست کو سیاسی اکائی کی حیثیت حاصل تھی۔ ہر شہری ریاست کا مربی اور سب سے بڑا دیوتا (یا دیوی) الگ الگ تھا۔ شہری ریاست کا سارا علاقہ اس مربی اور نگران دیوتا کے لئے مخصوص ہوتا تھا۔ پجاریوں اور مندروں کی تنظیم کے ذریعے یہ مربی دیوتا تمام امور میں سب سے زیادہ اقتدار و اہمیت کا حامل تھا۔ غیر مذہبی حکمرانوں کی ضرورت محض جنگ کے دنوں میں پڑتی تھی' ورنہ ابتدا میں عام امن و امان کے حالات میں ان حکمرانوں کے اختیارات برائے نام ہی ہوتے تھے۔ قوت کا اصل سرچشمہ پاپائیت تھی۔ تمام شہری ریاستیں الگ الگ ہونے کے باوجود یکساں اور مشترکہ تہذیب و تمدن اور مذہبی عقیدوں کے بندھنوں میں منسلک تھیں۔

سماجی طبقے

ان شہری ریاستوں میں تین طبقے آباد تھے۔ سب سے اونچا طبقہ عمیلو کہلاتا تھا۔ اس طبقے میں امراء' مندر کے پروہت اور منشی لوگ (افسر) شامل تھے۔ منشیوں کو نظم و نسق میں بڑا دخل تھا۔ عدالتوں کے جج اور منصف اور فوجی افسر بھی عمیلو طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔

دوسرا طبقہ مشکینو کہلاتا تھا۔ یہی لفظ عربی زبان میں منتقل ہو کر مسکین بن گیا۔ اس طبقے میں بیوپاری' کاریگر اور دستکار شامل تھے۔ ان کو اسلحہ رکھنے کی اجازت نہ تھی اور نہ یہ لوگ فوج میں بھرتی ہو سکتے تھے۔

تیسرا طبقہ غلاموں کا تھا۔

گاؤں میں بھی تین طبقے تھے۔ اول شرفاء کا' جن کا امتیازی نشان رتھ تھا۔ دوسرا طبقہ باغبانوں' چرواہوں اور سائیسوں کا تھا۔ تیسرا طبقہ کاشت کاروں اور کھیت مزدوروں کا تھا۔ فوجی سپاہی عام طور پر اسی تیسرے طبقے سے بھرتی کئے جاتے تھے۔ زمین کا لگان جنس میں وصول کیا جاتا تھا۔ اس کے لئے ہر گاؤں میں پیدائش اور موت کا ایک رجسٹر ہوتا تھا۔ اس رجسٹر میں ان سب دیہاتیوں کی تفصیل درج ہوتی جو اس شہر کے ماتحت تھے۔ بعض رجسٹر ایسے بھی برآمد ہوئے ہیں جن میں ہر گاؤں کے مکان کا نمبر شمار اور مالک مکان کا سماجی رتبہ اور پیشہ بھی درج ہے۔

تعلیم اور مدرسے

آج سے چھ ہزار سال پہلے ان لوگوں نے مدرسے بھی قائم کر رکھے تھے۔ جب تجارت ہوتی تھی اور سرکاری دفاتر کھل گئے تھے تو ان میں کام کرنے کے لئے کلرکوں کی ضرورت تھی اور یوں کلرکوں کی تعلیم ایک لازمی ضرورت کی صورت میں سامنے آ گئی تھی۔ پس مدرسے قائم کئے گئے۔ ابتدا میں یہ مندروں کا حصہ تھے۔ حمورابی کے زمانے کے مدرسے کا نقشہ چند الواح کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ ایک میں کچھ لڑکے اور لڑکیاں فرش پر بیٹھے کچھ پڑھ رہے ہیں۔ ایک اور لوح میں استاد بچوں کو پڑھاتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ دوسری لوح میں ایک بچے کو دکھایا گیا ہے کہ وہ کتنی مشکل سے تین سو چار سو علامتوں (حروف) کو سمجھنے اور لکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

طالب علم کی تختی نرم و ملائم مٹی کی بنی ہوتی تھی' جس پر وہ سرکنڈے کے قلم سے بار بار مشقیں کر سکتا تھا اور لکھے ہوئے الفاظ کو حسبِ ضرورت کنکر یا لکڑی کے ٹکڑے سے مٹا سکتا تھا۔ قلم ہاتھ میں لے کر وہ ایک ایک حرف کو افقی' عمودی اور ترچھی صورت میں لکھتا تھا۔ ان کے قدیم پیکانی رسم الخط میں ہر حرف تکون ہوتا تھا۔ جب تک اسے سبق یاد کرنے اور لکھنے پر قدرت حاصل نہ ہو جاتی' استاد اس سے بار بار مشق کراتا رہتا۔ حروف کی تکمیل کے بعد پھر اس سے لفظ بنوائے جاتے۔ لفظوں سے جملے بنوائے جاتے۔ پھر پرانی سرکاری دستاویزات سے خاص خاص جملے نقل کرائے جاتے۔ ایک ایسی لوح بابل کے کھنڈرات سے برآمد ہوئی

ہے جس میں نویسندہ (منشی یا کاتب) کی تعریف میں گویا ایک محاورہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس میں کندہ ہے: ''لوح نویس بنو اور آفتاب بن جاؤ۔'' اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ زمانہ قدیم کے لوگ فنِ تحریر کی کس قدر عزت و تکریم کرتے تھے۔

کتب خانے

اشور بنی پال کے دریافت شدہ محل سے اس کی مشہور زمانہ لائبریری بھی برآمد ہوئی ہے۔ اس نے اپنے ادبی ذوق کے بارے میں خود ایک کتاب (لوح) میں لکھا ہے: ''میرے والد صاحب نے مجھے صرف تیراندازی اور گھڑسواری نہیں سکھائی' بلکہ لوح نویسی کی بھی تربیت دلوائی اور موجودہ زمانے کے تمام علوم سکھائے۔'' وہ خود شجاع اور جنگجو ہی نہ تھا' بلکہ علوم و فنون کا دلدادہ تھا۔ اس نے اپنے منشیوں کو حکم دے رکھا تھا کہ تمام تحریریں جمع کی جائیں' خواہ وہ کسی بھی موضوع پر ہوں اور کہیں سے بھی دستیاب ہوں اور خواہ ان کی فراہمی پر کتنی بھی مشکلات پیش آئیں اور کتنا ہی خرچہ برداشت کرنا پڑے۔ اس کے ایک اور حکم کی رو سے علماء اور ماہرین کو یہ اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ جہاں مناسب اور ضروری خیال کریں' اصل متن کی نظر ثانی کریں اور قدیم علم کو جدید علم سے ہم آہنگ کرنے کے لئے اگر ترمیم بھی کرنی پڑے تو ضرور کی جائے۔ ہوتے ہوتے اشور بنی پال کی سرپرستی میں اس کے کتب خانے میں 22 ہزار سے زیادہ الواح (کتابیں) جمع ہو گئیں۔ عراق کے زوال کے بعد یہ الواح تقریباً ڈھائی ہزار سال تک ملبے میں پڑی رہیں اور اب ایک سو سال قبل ماہرین اثریات کی مہربان توجہ سے اس نفاست سے برآمد ہوئی ہیں کہ ان میں سے ایک کتاب بھی ضائع نہیں ہوئی۔ 22 ہزار سے زیادہ کتابوں پر مشتمل یہ لائبریری برٹش میوزیم' لندن میں جوں کی توں حفاظت سے رکھوا دی گئی ہے۔

دنیا کا پہلا ضابطۂ قانون

بابل کے پہلے حکمران خاندان کے چھٹے بادشاہ حمورابی نے بابل کی ساری شہری ریاستوں کو متحد کر کے اس سلطنت کی بنیاد ڈالی جو تاریخ میں ''قدیم بابلی سلطنت'' کہلاتی ہے۔ حمورابی نے اپنے پورے مفتوحہ علاقے میں پوری طرح سے امن و امان قائم کیا۔ نئے مندر بنوائے۔ مالیاتی نظام میں ضروری اصلاحات کیں۔ آبپاشی' فنِ تعمیر' نقل و حمل اور دفاع و سلامتی کے انتظامات بہتر بنائے اور تاریخی کیلنڈر میں مناسب ترامیم کیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک ''قانون نامہ'' مرتب کیا' جسے ایک لاٹ پر کندہ کرایا گیا تھا۔ یہ لاٹ اب بھی اچھی حالت میں ہے۔ فقط پانچ چھ جگہوں پر عبارت مٹ گئی ہے' جس کی وجہ سے حمورابی کے تقریباً 35 قوانین ضائع ہو گئے ہیں' لیکن ان قوانین کی نقلیں اتفاق سے دوسرے مقامات سے برآمد ہو چکی ہیں اور ان کی مدد سے حمورابی کا پورا ضابطہ مرتب کر لیا گیا ہے۔ اس ضابطے میں کل 286 دفعات ہیں۔

قوانین کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: املاک' لین دین' ضابطۂ فوجداری' ازدواجی تعلقات اور غلام و آقا کے تعلقات۔ سزا کی دو قسمیں تھیں: جسمانی سزا اور مالی سزا۔ ہاتھ' کان' ناک' چھاتی اور زبان کاٹ دینا' آگ میں جلا دینا' ہاتھ پاؤں باندھ کر دریا میں پھینک دینا اور قتل کر دینا جسمانی سزائیں تھیں۔ مالی سزا میں جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا' لیکن کوڑے مارنے یا قید کرنے کی سزائیں نہ ہوتی تھیں۔

34 جرائم ایسے تھے جن کی سزا موت تھی۔ قتل اور جادوگری کا الزام اگر جھوٹا ثابت ہوتا تو مدعی کو موت کی سزا دی جاتی۔ چوری کی سزا بھی موت تھی۔ چوری کا جھوٹا الزام لگانے والے کی سزا بھی موت تھی۔ غلام یا کنیز کے فرار میں مدد دینے یا ان کو اپنے گھر میں پناہ دینے کی سزا بھی موت تھی۔ جنگی مہم میں اپنی جگہ کسی بھاڑے کے آدمی کو بھیجنے کی سزا بھی موت تھی۔ اگر کوئی مکان تعمیری نقص کی وجہ سے گر جاتا اور مالک مکان اس میں دب کر مر جاتا تو معمار کو قتل کر دیا جاتا تھا' اور اگر مالک مکان کا بیٹا ہلاک ہو جاتا تو معمار کے بیٹے کو جان سے مار دیا جاتا تھا۔

ازدواجی تعلقات کو بہت تفصیل سے منضبط کیا گیا تھا۔ ضابطے کے بموجب شادی ایک معاہدہ تھی' جو شادی کے وقت اگر باقاعدہ طور پر مرتب نہ ہوتا تو عدالت شادی کو تسلیم نہ کرتی۔ مرد اور عورت دونوں کو طلاق کا حق تھا اور طلاق کی بھی باقاعدہ تحریر ہوتی تھی۔ عورت اگر اپنے شوہر کو ناپسند کرتے ہوئے یہ اعلان کر دیتی کہ میں تمہارے ساتھ ہرگز نہ سوؤں گی تو بلدیہ اس کے چال چلن کو جانچ کرتی' اور اگر یہ ثابت ہو جاتا کہ قصور عورت کا نہیں ہے تو اس کو اپنا جہیز لے کر میکے جانے کی اجازت دے دی جاتی تھی۔

پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کی اجازت نہ تھی۔ منگنی' مہر اور جہیز کا رواج تھا۔ جہیز عورت کی ذاتی ملکیت تصور ہوتا تھا۔ باپ بیٹے کو عاق کر سکتا تھا' لیکن اس کے لئے عدالت کی اجازت ضروری تھی۔ بیٹی کو باپ کی جائیداد میں بیٹوں کے برابر حصہ ملتا تھا' لیکن وہ اس جائیداد کو رہن یا فروخت نہیں کر سکتی تھی' اور نہ یہ جائیداد اس کی اولاد کو ورثے میں ملتی تھی' بلکہ اس کی وفات کے بعد یہ اس کے بھائیوں میں تقسیم ہو جاتی تھی۔

''ضابطۂ قانون'' کا اختتام حمورابی نے خودستائی کے ان کلمات پر کیا ہے:

عظیم دیوتاؤں نے مجھے حکم دیا
پس میں وہ مہربان گڈریا بنا' جس کے عصا میں خیر ہے
میرا سایۂ رحمت میرے شہر پر ہے
میں نے ارض سومیر و عکاد کے لوگوں کو اپنے دل میں جگہ دی ہے
میری حفاظت میں وہ خوشحال ہوئے اور پھلے پھولے
میں نے ان پر امن سے حکومت کی
میں نے اپنی طاقت سے انہیں ہر آفت سے بچایا

مذہبی عقائد

قدیم اہلِ عراق کا مذہب فطرت پرستی یعنی شرک تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عراقی دیومالا میں کائنات کے تمام اہم مسائل دیوتاؤں کی مجلس شوریٰ میں طے پاتے ہیں۔ کائنات پر کسی ایک دیوتا کی فرماں روائی نہیں ہے' بلکہ جو بھی فیصلہ ہوتا ہے' وہ باہمی صلاح مشورے سے ہوتا ہے۔ مجلس شوریٰ ہی یہ فیصلہ بھی کرتی ہے کہ اس کے احکام نافذ کرنے کا فرض کس دیوتا کے سپرد کیا جائے۔ حضرت عیسیٰؑ سے پہلے عراق میں آباد اقوام میں جن دیوی دیوتاؤں کی پرستش کی جاتی تھی' ان کی تعداد سات ہزار سے زیادہ ہے' لیکن اکثر قوموں کے ساتھ ان کے نام بدل جاتے تھے۔ یہاں چند بڑے بڑے دیوتاؤں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے' تاکہ اندازہ ہو سکے کہ عراقیوں کے مذہبی عقائد کیا تھے۔ سب سے بڑے تین دیوتا تھے۔

انو (Anu)

اس کے لفظی معنی آسمان کی وسعت و پہنائی کے ہیں۔ آسمان کی وسعت زمین' سورج' چاند اور ستاروں سب کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ اس لئے دیوتاؤں کی مجلس شوریٰ میں انو کی شخصیت سب سے زیادہ لائق احترام ہے۔ وہ سب دیوتاؤں سے زیادہ بزرگ' سنجیدہ' متحمل مزاج اور باوقار ہے۔ وہ قاعدے قانون سے کبھی انحراف نہیں کرتا اور نہ کبھی جانبداری دکھاتا ہے۔ وہ نہایت نیک' رحم دل اور خطاپوش ہے۔ دیوتاؤں کی مجلس شوریٰ طلب کرنا انو کا فرض تھا۔ البتہ وہ عام طور پر اظہار رائے سے گریز کرتا تھا۔ موجوداتِ عالم کی تقدیر کا فیصلہ ایک لوح پر لکھ لیا جاتا تھا' جس کا محافظ انلیل تھا۔

انلیل (Enlil)

یہ انو کا بیٹا اور طوفان اور ہوا کا دیوتا تھا۔ وہ اپنے باپ انو کی قوت تھا۔ مجلسِ شوریٰ کے فیصلوں پر عمل درآمد کا فرض اسی کے سپرد ہوتا تھا۔ آسمان اور زمین کے درمیان اسی کا راج تھا۔ اسی نے زمین کو آسمان سے الگ کیا تھا' ورنہ ابتدا میں دونوں آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ مجلس شوریٰ میں بھی اکثر اسی کی بات مانی جاتی تھی۔ انلیل کی اس ہیبت و قوت کی وجہ سے نپور شہر' جہاں انلیل کا بڑا مندر تھا' وادی کا سب سے مقدس شہر خیال کیا جاتا تھا۔ بادشاہوں کی رسم تاج پوشی انلیل کے مندر ہی میں ادا ہوتی تھی اور وادیٔ دجلہ و

فرات کا ہر بادشاہ اپنا وقار بڑھانے کی خاطر نپور کو اپنی حکومت میں شامل کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔ مقامی زبانوں میں سب سے زیادہ بھجن اور حمد و ثنا انلیل ہی کی تعریف میں ہیں۔

انکی (Enki)

یہ زمین اور پانی کا دیوتا تھا۔ اس دیوتا کی شخصیت بہت پیچیدہ ہے۔ وہ بیک وقت خشکی کا دیوتا بھی ہے اور پانی کا بھی۔ کسی ایک دیوتا میں خشکی اور تری کا امتزاج بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے' لیکن یہ تصور دراصل اس تجربے کا پرتو ہے جو دجلہ اور فرات کے ڈیلٹا (جنوبی عراق) میں رہنے والوں کو ہر روز ہوتا ہے۔ وہاں دلدل اور ندی نالے اس کثرت سے ہیں کہ خشکی اور تری میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کا لازمی جز ہیں۔

ننا (Nanna)

چاند کی چاندنی اور سورج کی تابانی نے سبھی قدیم اقوام کو متاثر کیا ہے۔ چنانچہ مصر' ایران' ہندوستان' چین اور یونان و روم' غرضیکہ ہر ملک میں چاند اور سورج کو رتبہ حاصل تھا۔ یہی حال عراق کا بھی تھا۔ البتہ اتنا فرق ضرور تھا کہ اہلِ عراق دوسروں کی نسبت چاند کو سورج پر فضیلت دیتے تھے۔ ان کی عقیدے کی رُو سے شمس دراصل ننا (چاند) کا بیٹا تھا۔ اسی طرح شام اور فلسطین کی قدیم قوموں کا بڑا دیوتا چاند تھا جسے ایلات کہتے تھے۔

شمس (Utu)

سورج دیوتا۔ یہ درست ہے کہ اہلِ عراق چاند کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور اس کی ٹھنڈی اور پُراسرار روشنی ان کو آرام پہنچاتی تھی' مگر وہ جانتے تھے کہ زندگی کی ساری رونق سورج ہی کے دم سے ہے۔ سورج جہاں ہیں' جہاں ہاں' دانائے راز قرار پایا۔ اس کی نگاہیں ہر نیکی بدی کو دیکھ لیتی تھیں۔ انسان کی کوئی حرکت اس سے پوشیدہ نہیں تھی اور نہ کائنات کا کوئی گوشہ اس سے چھپا ہوا تھا' لیکن اس ہمہ گیر قوت کے باوجود وہ نہایت شفیق' ستار عیوب اور رحم دل دیوتا تھا۔ وہ مشکل کے وقت ہر حاجت مند کے کام آتا تھا۔ وہ انصاف اور صداقت کا پیکر تھا۔ وہ برے لوگوں کو سزا دیتا تھا اور نیک لوگوں کو انعام و اکرام سے نوازتا تھا۔

مردوک (Marduk)

بابل کی نئی سلطنت کا سب سے بڑا دیوتا۔ یہ بابل کی پرانی سلطنت میں انلیل کہلاتا تھا۔ بابل کے زمانہ عروج میں اس کا نام بدل کر مردوک رکھ دیا گیا۔ آگے چل کر اسے ''بعل'' کہنے لگے۔ اہلِ بابل کے عقیدے کے مطابق پوری کائنات کا خالق مردوک ہی تھا۔

عشتار (Ishtar)

یہ محبت اور افزائش کی دیوی تھی اور موسم بہار کی نمائندہ۔ اس کی شخصیت جتنی دلکش اور رنگین ہے' اتنی ہی آفاقی بھی ہے۔ وہ سومیر میں انانا ہے' بابل میں عشتار ہے' مصر میں ازیس ہے' فلسطین میں انات ہے' ایران میں شالا ہے۔ ہندوستان میں گوری' اوشا' سرسوتی ہے۔ یونان میں ایفرودتی ہے۔ عربوں کی زہرہ ہے' جس نے ہاروت اور ماروت کو اپنے دامِ محبت میں گرفتار کر کے ان سے اہم راز معلوم کر لیا تھا اور ستارہ بن کر آسمان پر چلی گئی تھی۔

بعل (Baal)

اس کا ذکر قرآن مجید کی سورۂ صافات میں آیا ہے۔ اس کے معنی قوت کے ہیں۔ اسی بُت نے حجاز پہنچ کر ''بعل'' کی شکل اختیار کی تھی۔ اسے خانہ کعبہ میں نصب کیا گیا اور یہ قریش کا سب سے بڑا دیوتا بن گیا۔ بعل کی پوجا نے شدید بت پرستی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس کا بُت بیل پر سوار دکھایا جاتا تھا' کیونکہ بیل تولیدی قوت کا مظہر تھا۔ بت کے ہاتھوں میں انگور کے خوشے اور انار ہوتے تھے۔ اسے آسمان کا حکمران مانا جاتا تھا جو زمین کو حاملہ کرتا ہے۔ اس کے انسانی چہرے کے گرد روشنی کی کرنوں کا لاحقہ ہوتا ہے۔

بعل دیوتا کی تحریم و تکریم میں لوبان جلانے کے علاوہ بیلوں کی بھی قربانی کی جاتی تھی' لیکن خاص قربانی بچوں کی ہوتی تھی۔ یہ ہولناک رسم اس تخیل پر مبنی تھی کہ بچے والدین کے لئے سب سے پیاری شے ہیں اور پاک اور معصوم ہونے کی بناء پر ان کی قربانی بعل دیوتا کا غصہ فرو کرنے کے لئے زیادہ کارگر ہوتی تھی۔ بچوں کی قربانی کا طریقہ یہ تھا کہ بُعل کا بت' جو دھات کا بنا ہوتا' اس کے اندر آگ جلا کر سخت گرم کیا جاتا۔ بچوں کو اس کے پھیلے ہوئے ہاتھوں میں دے دیتے جو ہاتھوں سے لڑھک کر اس کی آتشیں گود میں جا گرتے۔ والدین بخوشی اپنے بچوں کی قربانی کرتے تھے' حتیٰ کہ پہلا بلکہ اکلوتا بیٹا بھی قربان کر دیا جاتا تھا۔ بچوں کو بہلا پھسلا کر چپ کرا دیتے' کیونکہ بھینٹ چڑھائے جانے والے بچے کو رونا نہیں چاہئے۔ اس کے چیخنے چلانے کی آوازوں کو نقاروں اور بانسریوں کی آوازوں میں دبا دیا جاتا۔ یہ قربانیاں یا تو سالانہ کسی مقررہ دن پر ہوتیں یا پھر کسی بڑی قدرتی آفت کے وقت دیوتاؤں کا غصہ فرو کرنے کے لئے۔

مذکورہ بالا خاص خاص دیوتاؤں کے علاوہ تمام مظاہر قدرت کے الگ الگ دیوتا بھی تھے۔ ان چھوٹے چھوٹے دیوتاؤں کی وہ حیثیت تو نہ تھی جو بڑے دیوتاؤں کو حاصل تھی' لیکن اہلِ عراق ان کی بھی پوجا کرتے تھے اور ان کے بُت مندروں میں رکھتے تھے۔ ایک اندازے کے مطابق عراق میں کم از کم تین ہزار دیوی دیوتاؤں کی پوجا ہوتی تھی۔ ان خداؤں کے علاوہ ہر خاندان بلکہ ہر گھر کا ایک ذاتی معبود بھی ہوتا تھا۔ اس معبود کا نام نہ تھا۔ اس کے لئے ہر گھر میں ایک چھوٹا سا حجرہ یا گوشہ مخصوص ہوتا تھا اور خاندان کا بزرگ اس حجرے میں بیٹھ کر اپنے انفرادی دیوتا کی پوجا کرتا تھا۔ اس معبود سے گھر والوں کے تعلقات بالکل ذاتی ہوتے تھے' بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ وہ گھر کا ایک فرد ہوتا تھا۔

سرزمینِ انبیاء

سوائے اللہ کے آخری رسولؐ کے' وہ تمام انبیائے کرام جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے' ان کا تعلق اسی سرزمین سے رہا ہے۔ یاد رہے کہ عہدِ قدیم میں عراق نام کا کوئی ملک صفحۂ ہستی پر موجود نہ تھا' اور نہ ہی اس کی وہ سرحدیں تھیں جو آج ہیں۔ عراق' اردن' فلسطین' شام پر مشتمل یہ سب ایک ہی خطہ تھا' جسے مورخین میسوپوٹیمیا یا وادیٔ دجلہ و فرات کا نام دیتے ہیں۔ قرآن مجید میں جن انبیائے کرام کا نام آیا ہے' ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: حضرت آدمؑ' حضرت نوحؑ' حضرت ادریسؑ' حضرت ہودؑ' حضرت صالحؑ' حضرت ابراہیمؑ' حضرت لوطؑ' حضرت اسحاقؑ' حضرت اسماعیلؑ' حضرت شعیبؑ' حضرت یعقوبؑ' حضرت یوسفؑ' حضرت موسیٰؑ' حضرت ہارونؑ' حضرت داؤدؑ' حضرت سلیمانؑ' حضرت زکریاؑ' حضرت یحییٰؑ' حضرت یونسؑ' حضرت ایوبؑ' حضرت الیاسؑ' حضرت عیسیٰؑ اور سب سے آخر میں حضرت محمد ﷺ جن کا نسبی تعلق سرزمینِ عراق کی بجائے سرزمین حجاز سے ہے۔

خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کے سوا تمام انبیاء کا تعلق وادیٔ دجلہ و فرات اور فلسطین کے اردگرد کی سرزمین سے ہے' البتہ حضرت آدمؑ کے بارے میں وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ توریت میں بعض اشارے ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق بھی اسی سرزمین سے تھا۔ مثلاً جنتِ ارضی کے بارے میں توریت میں یوں نقشہ کھینچا گیا ہے:

> ''یہ مشرقی عدن کا ایک باب تھا۔ عدن سے ایک دریا باغ کے سیراب کرنے کو نکلا اور وہاں سے چار ندیوں میں تقسیم ہوا۔ پہلی کا نام فیسون ہے جو حویلہ کی ساری زمین کو' جہاں سونا ہوتا ہے' گھیرے ہوئے ہے اور اس زمین کا سونا چوکھا ہے اور وہاں موتی اور سنگِ سلیمانی بھی ہیں۔ اور دوسری ندی کا نام جیحون ہے جو کوش کی ساری زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ اور تیسری ندی کا نام دجلہ ہے جو اشور کے مشرق کو جاتی ہے اور چوتھی کا نام فرات ہے۔ اور خداوند خدا نے آدم کو لے کر باغِ عدن میں رکھا کہ اس کی باغبانی اور

نگہبانی کریں۔''

بائبل کے اس بیان کے مطابق آدم جو محض ایک بشر ہے اور جس کو ابھی نبوت نہیں ملی' اگرچہ اس کو نبوت کے لئے منتخب کر لیا گیا ہے' اس زمانے میں عدن میں رہتا تھا اور اس باغ کے نگہبان اور باغبان کی حیثیت سے آرام و سکون کی زندگی بسر کر رہا تھا' لیکن پھر پہلا گناہ سرزد ہونے پر ''خداوند خدا نے باغِ عدن سے باہر کر دیا' تا کہ وہ اس زمین کی طرف واپس چلا جائے' جس میں سے وہ لیا گیا تھا اور کھیتی باڑی کرے۔''

توریت کے اس اقتباس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ آدم پہلے کھیتی باڑی کرتے تھے۔ پھر ترقی ہوئی تو باغِ عدن کے باغبان بن گئے۔ جب ایک خاص شرط پوری نہ کرنے پر زوال آیا تو دوبارہ اسی زمین کی کھیتی باڑی کرنے لگے۔ اس خیال کو تقویت مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی تفسیر ماجدی میں یہ لکھ کر دی:

''آدم جنت سے زمین پر آئے تو غالباً وادیٔ دجلہ و فرات میں آ کر آباد ہوئے جو اب ملک عراق کہلاتا ہے' وہی جو سرزمینِ انبیاء کہلاتی ہے۔''

آدم ثانی حضرت نوحؑ کی ولادت اور ان کی کشتی اور طوفانِ نوح کا پورا قصہ اسی سرزمین سے علاقہ رکھتا ہے۔ حضرت ادریسؑ کی جائے پیدائش کوفہ ہے جو عراق کے وسط میں واقع ہے' جس کے جنوب میں کچھ فاصلے پر بابل واقع ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا وطن مالوف اُر (ur) ہے جو اب اثری کھدائیوں سے زمین کی گہرائی سے نکل آیا ہے۔ آج کل اس شہر کا نام مقیر ہے۔ اب یہ مقام بابل اور خلیج فارس کے درمیان واقع ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے حضرت لوطؑ بھی اسی شہر اُر میں پیدا ہوئے۔ حضرت اسحاقؑ بھی یہیں تولد ہوئے اور ان کی ساری عمر فلسطین میں گزری۔ وہ قریہ اربع (حبرون) میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارہ کے پہلو میں مکفیلہ کے قبرستان میں دفن ہیں۔ حضرت اسماعیلؑ کی ولادت بھی یہیں کی ہے۔ ان کا بچپن اپنے والد بزرگوار کی صحبت میں کنعان (فلسطین) میں گزرا۔ جب ان کے چھوٹے بھائی حضرت اسحاقؑ حضرت سارہ کے بطن سے پیدا ہوئے تو اس وقت حضرت اسماعیلؑ کی عمر تیرہ سال تھی۔ کچھ عرصے کے بعد حضرت ابراہیمؑ اپنی زوجہ حضرت حاجرہ اور بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو لے کر حجاز کی طرف چلے گئے جہاں باپ بیٹے نے مل کر بیت اللہ کی تعمیر کی۔

حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد جب بنی اسرائیل فلسطین و عراق میں داخل ہوئے تو یہاں' جیسا کہ پہلے بھی بیان ہوا' مختلف قومیں آباد تھیں۔ حطی' فونیقی' آرمینی' سیتھیائی' فرجیائی' فلسطی وغیرہ۔ ان قوموں میں بدترین شرک پایا جاتا تھا۔ ان کے سب سے بڑے معبود کا نام ''ایل'' تھا جسے یہ دیوتاؤں کا باپ کہتے تھے اور اسے عموماً سانڈ سے تشبیہ دی جاتی تھی۔ اس کی بیوی کا نام عشتار تھا' اور اس سے خداؤں اور خدانیوں کی پوری نسل چلی تھی' جس کی تعداد 70 تک پہنچتی تھی۔ اس کی اولاد میں سب سے زبردست بعل تھا' جس کو بارش اور روئیدگی کا خدا اور زمین و آسمان کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ شمالی علاقوں میں اس کی بیوی اناث کہلاتی تھی اور فلسطین میں عشارات۔ یہ دونوں عشق اور افزائش نسل کی دیویاں تھیں۔ اس کے علاوہ کوئی دیوتا موت کا مالک تھا' کسی دیوی کے قبضے میں صحت تھی۔ کسی دیوتا کو وبا اور قحط لانے کے اختیارات تفویض کئے گئے تھے' اور یوں ساری خدائی بہت سے معبودوں میں بٹ کر رہ گئی تھی۔ ان دیوتاؤں اور دیویوں کی طرف ایسے ایسے ذلیل اوصاف اور اعمال منسوب تھے کہ اخلاقی حیثیت سے بہت بدکردار انسان بھی ان کے ساتھ مشتہر ہونا پسند نہ کریں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ ایسی کمینہ ہستیوں کو خدا بنائیں اور ان کی پرستش کریں' وہ اخلاق کی ذلیل ترین پستیوں میں گرنے سے کیسے بچ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جو اثرات آثارِ قدیمہ کی کھدائیوں سے دریافت ہوئے ہیں' وہ شدید اخلاقی گراوٹ کی شہادت بہم پہنچاتے ہیں۔ ان کے ہاں بچوں کی قربانی کا عام رواج تھا۔ ان کی عبادت گاہیں زنا کاری کے اڈے بنے ہوئے تھے۔ عورتوں کو دیوداسیاں بنا کر عبادت گاہوں میں رکھنا اور ان سے بدکاری کرنا عبادت کے اجزا میں داخل تھا۔ اسی طرح کی اور بہت سی بداخلاقیاں بھی ان میں پھیلی ہوئی تھیں۔

لیکن جب بنی اسرائیل فلسطین و عراق میں داخل ہوئے تو وہ اس ہدایت کو بھول گئے۔ انہوں نے اپنی کوئی متحدہ سلطنت قائم نہ کی۔ وہ قبائلی عصبیت میں مبتلا تھے۔ ان کے ہر قبیلے نے اس بات کو پسند کیا کہ مفتوح علاقے کا ایک حصہ لے کر الگ ہو جائے۔ اس تفرقے کی وجہ سے ان کا کوئی قبیلہ بھی اتنا طاقتور نہ ہو سکا کہ اپنے علاقے کو مشرکین سے پوری طرح پاک کر دیتا۔ آخر کار انہیں یہ گوارا کرنا پڑا کہ مشرکین ان کے ساتھ رہیں' بسیں۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے مفتوحہ علاقوں میں جگہ جگہ ان مشرک قوموں کی چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں بھی موجود رہیں جن کو بنی اسرائیل مسخر نہ کر سکے۔

اس کا پہلا خمیازہ تو بنی اسرائیل (یعنی ملتِ موسوی) کو یہ بھگتنا پڑا کہ ان قدیمی اقوام کے ذریعے سے ان کے مذہبی عقائد کے اندر شرک گھس آیا اور اس کے ساتھ بتدریج دوسری اخلاقی غلاظتیں بھی راہ پانے لگیں۔ دوسرا خمیازہ انہیں یہ بھگتنا پڑا کہ جن قوموں کی شہری ریاستیں انہوں نے چھوڑ دی تھیں' انہوں نے بنی اسرائیل کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کیا اور پے در پے حملے کر کے اس علاقے کے بڑے حصے سے ان کو بے دخل کر دیا' حتیٰ کہ ان سے خداوند کے

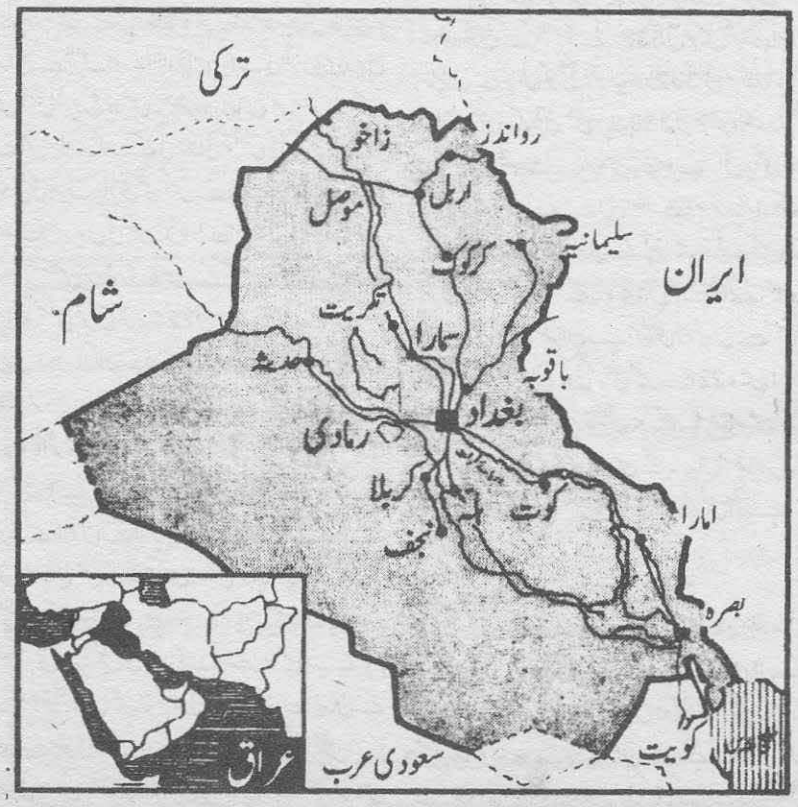

عہد کا صندوق (تابوتِ سکینہ) تک چھین لیا۔ آخر بنی اسرائیل کو ایک بادشاہ کے تحت اپنی ایک متحدہ سلطنت قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور ان کی درخواست پر حضرت سموئیل نبی نے 1020 قبل مسیح میں طالوت کو ان کا بادشاہ بنایا۔

اس متحدہ سلطنت کے تین فرماں روا ہوئے۔ طالوت (1020 تا 1004 ق م)' حضرت داؤدؑ (1004 تا 965 ق م) اور حضرت سلیمانؑ (965 تا 926 ق م)۔ ان فرماں رواؤں نے اس کام کو مکمل کیا جسے بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کے بعد نامکمل چھوڑ دیا تھا۔

یہودیوں پر شرک کا غلبہ

حضرت سلیمانؑ کے بعد بنی اسرائیل پر دنیا پرستی کا پھر شدید غلبہ ہوا اور انہوں نے آپس میں لڑ کر اپنی دو الگ سلطنتیں قائم کر لیں۔ شمالی فلسطین اور اردن میں سلطنتِ اسرائیل جس کا پایۂ تخت سامریہ قرار پایا اور جنوبی فلسطین اور ادوم کے علاقے میں سلطنت یہودیہ' جس کا پایۂ تخت یروشلم رہا۔ ان دونوں سلطنتوں میں سخت رقابت اور کشمکش روزِ اول سے شروع ہو گئی اور آخر تک رہی۔ یاد رہے کہ اُس زمانے میں عراق نام کا کوئی علاقہ موجود تھا نہ اُس کی سرحدیں وہ تھیں جو آج ہیں۔ یہ پورا خطہ فلسطین کا حصہ تھا۔

سلطنتِ اسرائیل کے فرماں روا اور باشندے ہمسایہ قوموں کے مشرکانہ عقائد اور اخلاقی فساد سے سب سے پہلے اور سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ حکومت کی طاقت و ذرائع سے شرک اور بداخلاقیاں سیلاب کی طرح یہودیوں میں پھیلنی شروع ہوئیں۔ حضرت الیاسؑ اور حضرت الیسعؑ نے اس سیلاب کو روکنے کی انتہائی کوشش کی' مگر یہ قوم جس تنزل کی طرف جا رہی تھی' اُس سے باز نہ آئی۔ آخر کار اللہ کا غضب اشوریوں کی شکل میں دولتِ اسرائیل کی طرف متوجہ ہوا اور فلسطین پر اشوری فاتحین کے مسلسل حملے شروع ہو گئے جن کا مسکن عراق تھا۔ 721 ق م میں اشور کے سخت گیر فرماں روا سارگون نے سامریہ کو فتح کر کے اسرائیل کا خاتمہ کر دیا۔ ہزارہا اسرائیلی تہ تیغ کیے گئے۔ 27 ہزار سے زیادہ بااثر یہودیوں کو ملک سے نکال کر اشوری سلطنت (عراق) کے مشرقی اضلاع میں تتر بتر کر دیا گیا' اور دوسرے علاقوں سے لا کر غیر قوموں کو اسرائیل کے علاقے میں بسایا گیا جن کے درمیان رہ بس کر بچا کھچا اسرائیلی عنصر بھی اپنی قومی تہذیب سے روز بروز زیادہ بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

بنی اسرائیل کی دوسری ریاست جو یہودیہ کے نام سے جنوبی فلسطین میں قائم ہوئی' وہ بھی حضرت سلیمانؑ کے بعد بہت جلدی شرک اور بداخلاقی میں مبتلا ہو گئی' لیکن اس کا اخلاقی زوال سلطنتِ اسرائیل کی نسبت سست رفتار تھا' اس لئے اس کو مہلت بھی کچھ زیادہ دی گئی۔ اگرچہ سلطنت اسرائیل کی طرح اس پر بھی اشوریوں نے پے در پے حملے کئے' اس کے شہروں کو تباہ کیا' اس کے پایۂ تخت کا محاصرہ کیا' لیکن یہ ریاست اشوریوں کے ہاتھوں ختم نہ ہو سکی' بلکہ صرف باج گزار بن کر رہ گئی۔ پھر جب حضرت یسعیاہ اور حضرت یرمیاہ کی مسلسل کوششوں کے باوجود یہودیہ کے لوگ بت پرستی' شرک اور اخلاقی بے راہ روی سے باز نہ آئے تو 598 ق م میں بابل کے بادشاہ بخت نصر نے یروشلم سمیت پوری سلطنتِ یہودیہ کو مسخر کر لیا' اور یہودیہ کا بادشاہ اُس کے پاس قیدی بن کر رہا۔ یہودیوں کی بداعمالیوں کا سلسلہ اس پر بھی بند نہ ہوا اور حضرت یرمیاہ کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنے اعمال درست کرنے کے بجائے بابل کے خلاف بغاوت کر کے اپنی قسمت بدلنے کی کوشش کرنے لگے۔ آخر 587 ق م میں بخت نصر نے ایک سخت حملہ کر کے یہودیہ کے تمام بڑے چھوٹے شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ یروشلم اور ہیکل سلیمانی کو اس طرح پیوندِ خاک کیا کہ اس کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ کھڑی نہ رہی۔ لاکھوں یہودیوں کو ان کے علاقے سے نکال کر ملک ملک میں تتر بتر کر دیا' اور جو یہودی اپنے علاقے میں رہ گئے' وہ بھی ہمسایہ قوموں کے ہاتھوں بری طرح ذلیل اور پامال ہو کر رہے۔ یہ تھا وہ پہلا فساد جس سے بنی اسرائیل کو متنبہ کیا گیا تھا اور یہ تھی وہ پہلی سزا جو اُس کی پاداش میں اُن کو دی گئی۔

اس کے باوجود یہودی شرارت' شرک اور بداخلاقیوں سے باز نہ آئے۔ 538 ق م میں شہنشاہ ایران سائرس نے بابل کو فتح کر لیا اور 332 ق م تک یہ شہر ایرانیوں ہی کے قبضے میں رہا۔ 330 ق م میں سکندر اعظم نے ایران کو شکست دے کر اُس کے صوبے عراق پر بھی قبضہ کر لیا۔ پھر سکندر نے اسے اپنی سلطنت کا مرکز بنا لیا۔ سکندر کی ایشیائی میراث سلوکیوں کے قبضے میں آئی جو اُس کے جنرل سلوکس کی اولاد تھے۔ 141 ق م سے 226 عیسوی تک پارتھی وہاں حکمران رہے جن کی رومیوں سے مستقل عداوت اور لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ 226ء میں ایران کے ساسانی بادشاہ اس پر قابض ہو گئے۔ 641ء میں عرب مسلمان عراق کے مالک و مختار بن گئے۔ یہاں مسلمانوں نے خلافتِ عباسیہ قائم کی (جس کا تذکرہ حصہ دوم میں آ رہا ہے)۔

قدیم عراقی تہذیب کے اثرات

وادیٔ دجلہ و فرات کی تہذیب مسلسل تین ہزار سال سے زیادہ عرصے تک زندہ رہی۔ اس کا زوال تو ایران کے ساسانی عہدِ حکومت ہی میں شروع ہو گیا تھا' لیکن سکندر اعظم کی فتوحات کے بعد یونان کے غلبے سے اس میں مقابلے کی طاقت بھی نہ رہی۔ رفتہ رفتہ اس کے قویٰ مضمحل ہو گئے اور پھر وہ ہمیشہ کے لئے مر گئی۔

یہودیوں پر عراقی اثرات

اس تہذیب کے زوال کے اسباب بھی وہی تھے جو ہر ملک' ہر قوم اور ہر طاقت کے زوال کے ہوا کرتے ہیں۔ یہاں اُن کے دہرانے سے کیا حاصل' البتہ اس کے مثبت اثرات کا حوالہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اِس تہذیب کے بڑے وارث یہودی ثابت ہوئے۔ اُن کے بعض آباء و اجداد 1800 قبل مسیح تک وادیٔ دجلہ و فرات کے مختلف شہری و دیہی علاقوں میں رہتے آئے تھے۔ انہوں نے بابلی رجحانات و خصوصیات اختیار کیں۔ ان تک بابل کی تخلیقِ کائنات اور سیلابِ عظیم (طوفانِ نوحؑ) کی داستانیں پہنچیں' جن کو انہوں نے ایسی پختگی اور مضبوطی سے اختیار کیا کہ صدیوں تک یہی سمجھا جاتا رہا کہ یہ فقط انہی سے منسوب ہیں اور عہد نامۂ عتیق (انجیل) میں اُن کا تذکرہ ہونے سے اُن کو تقدس کا درجہ بھی حاصل ہو گیا۔ علاوہ ازیں یہودیوں نے حمورابی کا ضابطۂ قانونی بھی اختیار کیا۔ بابل کے زمانۂ اسیری (586 تا 539 ق م) میں یہودیوں نے بابل کا مزید گہرا اثر قبول کیا۔ اس نصف صدی میں اسیری کے باوجود یہودیوں کا پہلی مرتبہ کسی باثروت' خوشحال اور طاقتور قوم سے واسطہ پڑا تھا۔ اپنے قید کرنے والے بابلیوں سے نفرت کرنے کے باوجود انہوں نے لاشعوری طور پر اُن کا طرزِ زندگی اختیار کیا۔ مثال کے طور پر اُن کے اندر کاروباری اور تجارتی رجحان کلدانیوں کے اثر سے پیدا ہوا۔ علاوہ ازیں قنوطیت' تقدیر پرستی اور اساطیر پسندی اُن کے مذہب میں کلدانیوں کے اثر سے آئی اور ان افکار و عقائد نے اتنی سختی اور درشتی اختیار کر لی کہ بعد میں آنے والے بنی اسرائیل کے انبیائے کرام بھی اُن کو پوری طرح ختم نہ کر سکے۔

یونان و روم پر عراقی اثرات

کئی سو سال کے بعد جب یونان اور پھر روم کی تہذیبوں نے عروج پایا' تو انہوں نے بھی بلاواسطہ وادیٔ دجلہ و فرات کی تہذیب سے اثر قبول کیا۔ یونان میں رواقیت کا فلسفہ' جس نے تقدیر پرستی اور قنوطیت کا باقاعدہ درس دیا' کلدانیہ ہی سے یونان گیا تھا۔ اس فلسفے کا بانی زینو تھا جو سامی النسل تھا اور فونیقیا کا باشندہ تھا۔ اُس نے یہ بتایا تھا کہ نیکی سب سے اعلیٰ اچھائی ہے۔ اس کا درس یہی تھا کہ لوگوں کو ضبطِ نفس سے کام لینا چاہئے۔ خوشی یا غمی کو خاطر میں نہیں لانا چاہئے اور بغیر کسی شکوے کے' اس اٹل تقدیر کو قبول کرنے کی ہمت پیدا کرنی چاہئے جو ہر کسی پر قادر ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر وادیٔ دجلہ و فرات کی تہذیب کا اثر رومیوں پر دیکھنا ہو تو اُن کی غیب دانی اور پیشین گوئی کرنے

کی عادت کو دیکھئے۔ سیاروں کو دیوتا سمجھ کر اُن کی پوجا کرنے کی رسم کو دیکھئے۔ اپنی عمارتوں میں محراب اور گنبد بنانے کا طریقہ دیکھئے۔ یہ تمام خصوصیات رومیوں نے وادیٔ دجلہ و فرات میں رہنے والوں سے حاصل کی تھیں۔ بعض دوسری خصوصیات رومیوں نے اس علاقے میں اپنی فوجی فتوحات سے اخذ واختیار کی تھیں۔ پھر خود روم میں وادیٔ دجلہ وفرات کے اکثر علاقوں سے تعلق رکھنے والے باشندے رہائش اختیار کئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ہر شخص کو اہلِ روم کلدانی کہا کرتے تھے اور مراد اُن کی یہ ہوتی تھی کہ یہ شخص نجومی ہے۔ چنانچہ اہلِ روم فال نکلوانے کے لئے ان کلدانیوں (قدیم عراقیوں) سے رجوع کیا کرتے تھے۔

پوری انسانیت پر عراقی اثرات

ایران و اسرائیل اور یونان و روم تو بہت پہلے کی اور متصل زمانے کی بات ہے آپ پوری انسانیت اور موجودہ انسانی تہذیب کو دیکھئے کہ وہ کس قدر وادیٔ دجلہ وفرات کی چھ ہزار سالہ قدیم تہذیب کے زیر اثر ہے۔ اہلِ مشرق ہوں یا اہلِ مغرب، یہودی ہوں یا عیسائی، مسلمان ہوں یا پارسی، ہندو ہوں یا بدھ، کون انکار کرسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے اپنے مذہبی وثقافتی دائرے میں رہتے ہوئے بابلی اثرات کو قبول واختیار نہیں کیا۔

ہفتے کے سات دن کہاں سے آئے؟ گھڑیوں اور گھنٹوں میں بارہ کا ہندسہ کہاں سے آیا؟ قمری اشکال و مراحل کے مطابق فصل خیزی کا خیال کہاں سے آیا؟ دائرہ البروج میں بارہ علامتیں کہاں سے آئیں؟ دائرے میں 360 درجے کس نے بنائے؟ ضرب اور تقسیم کے قاعدے ہمیں کس نے بتائے؟ تمام اُمتوں اور قوموں کو تحریر کا فن کس نے سکھایا؟ حساب، فلکیات، الجبرا، طب اور قانون کے بنیادی اصول ونظریات ہم نے کہاں سے مستعار لئے؟ محراب، گنبد اور مینار تعمیر کرنے کے ہنر ہم نے کن سے سیکھے؟ کرۂ ارض پر انسان کے اپنے ہاتھ کے قدیم ترین نوشتے اور ادبی شاہکار کس خطے میں تخلیق ہوئے؟

ان سوالوں کا ایک ہی جواب ہے کہ آج اکیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں بھی، پوری انسانیت پر پہلا احسان کرنے والے وہی پہلے انسان تھے جو وادیٔ دجلہ و فرات میں رہا کرتے تھے، جن کو آج نام نہاد ننگی مغربی تہذیب کے نام لیوا امریکا اور برطانیہ خوفناک بم باری اور بربریت سے نشانہ بنا رہے ہیں۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!!

سرزمین انبیاء واولیاء

عراق کے چھوٹے بڑے شہروں میں لاکھوں نبی، صحابی، غوث، قطب، ولی، امام اور بزرگ ہستیاں آسودۂ خاک ہیں۔ ایک سروے کے مطابق صرف بغداد شہر میں دس ہزار متبرک اور بزرگ ہستیوں کے مزار ہیں۔

چند خاص خاص مزارات کا تعارف:

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ: بغداد کے الروسفا علاقے میں آپ کا مزار ہے جسے القادریہ بھی کہتے ہیں۔ مزار اور مسجد آبادی کے درمیان میں ہے۔ اینٹوں اور جپسم سے تعمیر ہونے والا واحد اور سب سے بڑا گنبد ہے۔ 1970ء میں تزئین نو اور مرمت کی گئی۔

امام موسیٰ کاظم: بغداد کا علاقہ الکاظمیہ عراق کا سب سے قدیم قصبہ ہے جہاں قریش قبرستان بھی ہے جو عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے بنوایا تھا۔ خلیفہ امین الرشید اور ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ خاتون بھی یہیں دفن ہیں۔ امام موسیٰ کاظمؒ کے احاطے میں امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام ابو یوسف کا مزار بھی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ: علاقہ الاعظمیہ میں الخضر ان قبرستان میں ہے۔ مزار کا احاطہ کافی بڑا ہے۔ مزار کا گنبد الپ ارسلان نے 1067ء میں تعمیر کرایا تھا۔ موجودہ مسجد کا گنبد 1638ء میں تعمیر ہوا۔

جنید بغدادیؒ: ان کا اور ان کے ماموں سری سقیطی کے مزار بھی یہیں ہیں۔ حضرت جنید شاہی پہلوان تھے۔ انہوں نے ایک سیدزادے سے کشتی لڑی تھی اور ظاہری طور پر شکست کھائی، جبکہ باطنی طور پر آنحضورؐ کی بشارت سے ولایت حاصل ہوئی تھی۔

امام غزالیؒ: اس کا مزار ایک ایسے علاقے میں ہے جہاں بہت سارے لکڑی کے ٹال ہیں۔ چھوٹی سی چاردیواری کے اندر پہلے برآمدہ ہے۔ پھر چھوٹے سے کمرے میں قبر ہے۔ قبر کے اردگرد ڈیڑھ فٹ اونچا لکڑی کا کٹہرا ہے جس کے اوپر سبز اور سنہری رنگ کی چادر بچھی ہوئی ہے۔ مزار کا ماحول اور حالت امام کی عظمت کے شایان نہیں۔

منصور حلاج: الشیخ کے ایک بازار میں بغلی گلی میں اناالحق کہنے والے صوفی کا مزار ہے جو تزئین وآرائش کے اعتبار سے قابل دید ہے۔ قبر پر لکڑی کے باکس پر سنہری رنگ کی چادر ہے۔

علاوہ ازیں حضرت ابوالحسن نوری، شیخ شہاب الدین سہروردی، شیخ بہلول، حضرت معروف کرخی، داؤد طائی، حضرت یوشع بن نون، خلیفہ ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ خاتون اور دیگر سینکڑوں مشاہیر کے مزارات بغداد شہر کے چپے چپے میں موجود ہیں۔

''کُل جہاں'' معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''بیشک اللہ تعالیٰ نے میرے لئے زمین کو لپیٹ دیا، چنانچہ میں نے اس کے تمام مشارق ومغارب دیکھے اور یقیناً میری اُمت کا اقتدار وہاں تک پہنچے گا جہاں تک زمین کو میرے لئے لپیٹا گیا!'' (یعنی اہل اسلام کا اقتدار کرۂ ارض کے کونے کونے پر قائم ہوگا)

منجانب: **تنظیم اسلامی لاہور شرقی**

انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی کی کاوشیں

کیسٹ کلب اسکیم

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب
کے ایمان افروز خطابِ جمعہ کا کیسٹ
شہر کراچی میں ہر ہفتہ آپ کے گھر
پہنچانے کی اسکیم
سالانہ ممبر شپ فیس: 500 روپے

آسان عربی گرامر

ویڈیو کیسٹس/VCDs

گھر بیٹھ کر عربی گرامر کے قواعد سیکھیے یا کسی
بھی مقام پر عربی گرامر کلاسز منعقد کیجیے۔
مکمل عربی گرامر کی تدریس
28 ویڈیو کیسٹس/84 VCDs
میں دستیاب ہے

”قواعدِ تجوید

ویڈیو کیسٹ“

قرآنِ حکیم کی درست تلاوت کے لئے
قواعدِ تجوید کا علم ضروری ہے۔
”قواعدِ تجوید“ کے موضوع پر کتابچہ
کی تدریس ایک ماہرِ فن استاد کے
تعاون سے ایک ہی ویڈیو کیسٹ میں
دستیاب ہے۔

سود

حرمت۔ خباثتیں۔ اشکالات

ایک مختصر لیکن نہایت جامع اور مفید کتاب
جس میں قرآن وحدیث کی روشنی میں سود
سے متعلق تمام ضروری و بنیادی معلومات
اور اعتراضات کے مدلل جوابات شامل
کئے گئے ہیں۔

منتخب نصاب حصہ اوّل

نکات برائے درس و تدریس

دینِ اسلام اور اس کے تقاضوں کے فہم کے
لئے منتخب نصابِ قرآنی کی درس و تدریس
انتہائی مفید ہے۔
نکات کی صورت میں آیات کا لفظی ترجمہ،
تمہیدی و تفسیری تفاصیل موضوع سے متعلق
قرآنِ کریم کی دیگر
آیات و احادیث کے حوالہ جات

چہرے کا پردہ

علماء ومشائخ، مفکرین اور ادباء کے مستند
مضامین کا ایک گراں قدر مجموعہ
قرآن وسنت کی روشنی میں شرعی پردے
کے احکامات، اُن احکامات کی حکمت، چہرے
کے پردے کے لئے دلائل، اُمت کا متواتر
عمل اور اس حوالے سے اشکالات و
اعتراضات کے جوابات کتابی صورت میں

اہم دینی موضوعات

☆ اسلام مذہب ہے یا دین؟
☆ دینِ اسلام پر عمل کیسے کریں؟
☆ جہاد فی سبیل اللہ
☆ نبی اکرم ﷺ نے دین کیسے غالب کیا؟
☆ اسلام میں اجتماعیت کی اہمیت اور اساس
نکات برائے درس و تدریس کتابی صورت میں

ایک سالہ قرآن فہمی کورس

دنیا اور آخرت کی کامیابی کے حصول کے
لئے دینی و جدید علوم کا سیکھنا ضروری ہے۔
جدید تعلیم یافتہ حضرات وخواتین
کو قواعدِ تجوید، عربی گرامر، ترجمہ و تفسیرِ قرآن و
حدیث اور دینی و تحریکی لٹریچر کی تعلیم کا اہتمام
باصلاحیت اساتذہ کے زیرِ نگرانی۔
آغاز ہر سال رمضان المبارک کے بعد

لائبریریز اور مکتبہ جات کے پتے

1- 11۔ داؤد منزل، نزد فریسکو سوئیٹ، آرام باغ
2- حق اسکوائر، عقب اشفاق میموریل ہسپتال، یونیورسٹی روڈ، گلشن اقبال
3- قرآن مرکز نزد مسجد طیبہ، سیکٹر 35/A، کورنگی نمبر 4
4- فلیٹ نمبر 2، محمدی منزل، بلاک "K"، نارتھ ناظم آباد
5- C-113، مادام اپارٹمنٹس، نزد چھوٹا گیٹ، ایئرپورٹ
6- قرآن اکیڈمی یٰسین آباد، فیڈرل بی ایریا
7- متصل محمدی آٹوز، اسلام چوک، سیکٹر 11/2، اورنگی ٹاؤن
8- رضوان سوسائٹی بس اسٹاپ، یونیورسٹی روڈ

قرآن اکیڈمی، DM-55، خیابانِ راحت، درخشاں، ڈیفنس فیز 6، کراچی

فون: 5340022-23 فیکس: 5840009 ای میل: karachi@quranacademy.com ویب سائٹ: www.quranacademy.com

حصہ دوم

عراق: ورودِ اسلام سے سقوطِ بغداد تک

جنگ قادسیہ (636)

اہل عراق 632ء میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہدِ خلافت میں خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے تھے۔ یہ مرحلہ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں قادسیہ کے میدان میں مکمل ہوا۔ قادسیہ کی جنگ تاریخ اسلام کی فیصلہ کن جنگوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس جنگ میں ایرانیوں کو ایسی شکست ہوئی کہ وہ اپنے دارالحکومت مدائن کو بھی نہیں بچا سکے جو دریائے دجلہ کے مشرقی کنارے پر اس جگہ واقع تھا جہاں بعد میں بغداد آباد ہوا۔ مسلمان جب دریا کے کنارے پہنچے تو حضرت سعدؓ بن ابی وقاص نے خدا کا نام لے کر اپنا گھوڑا دجلہ میں ڈال دیا۔ اپنے سردار کو آگے بڑھتا ہوا دیکھ کر باقی مسلمانوں نے بھی اپنے گھوڑے دریا میں ڈال دیئے اور اس طرح پوری فوج بغیر پل کے دریا پار کر گئی۔ ایرانی یہ سمجھتے تھے کہ مسلمان دریا کو پار نہ کر سکیں گے، لیکن جب مسلمانوں نے دریا پار کر لیا تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور ایسے گھبرائے کہ ''دیو آ گئے، دیو آ گئے'' کہتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے اور مسلمانوں نے ان کے دارالحکومت پر آسانی سے قبضہ کر لیا۔ مسلمانوں نے اپنی اس شاندار کامیابی پر سب سے پہلے نمازِ شکرانہ پڑھی اور اس کے بعد جمعے کی نماز کسریٰ کے شاہی محل میں ادا کی۔

حضرت سعدؓ نے جب شاہی خزانہ اور مال و اسباب مدینہ روانہ کیا تو حضرت عمرؓ اسے دیکھ کر رو پڑے۔ لوگوں نے پوچھا کہ: ''یہ تو خوشی کی بات ہے۔ آپ روتے کیوں ہیں؟'' حضرت عمرؓ نے جواب دیا: ''میں اس لئے روتا ہوں کہ مال و دولت کی اس کثرت میں مجھے مسلمانوں کے زوال کے آثار نظر آ رہے ہیں۔'' مدائن کی فتح کے بعد مسلمان جلد ہی پورے عراق اور خوزستان کو خلافتِ اسلامیہ کے دائرے میں لے آئے۔

جنگ نہاوند (642ء)

حضرت عمرؓ چاہتے تھے کہ اب مسلمان اور آگے نہ بڑھیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ کاش ہمارے اور ایران کے درمیان آگ کا پہاڑ حائل ہو جاتا، کہ نہ ہم ایران پر حملہ کر سکتے اور نہ ایرانی ہمارے اوپر۔ لیکن ایرانی مجوسی اپنے علاقوں کی واپسی کے لئے برابر حملے کرتے رہتے تھے، جس کی وجہ سے حضرت عمرؓ کو مجبور ہو کر عام لشکر کشی کا حکم دینا پڑا۔ عراق اور ایران کی سرحد کے قریب نہاوند کے مقام پر ایرانیوں سے پھر ایک بڑی جنگ ہوئی۔ اس موقع پر ایرانیوں نے قادسیہ سے بھی زیادہ فوج جمع کر لی تھی، لیکن مسلمانوں کے مقابلے میں یہ تعداد ان کے کام نہ آئی۔ جنگ میں تیس ہزار ایرانی کام آئے اور ان کو شکست فاش ہوئی۔ اس جنگ میں اسلامی فوج کے سپہ سالار، صحابیِ رسولؐ حضرت نعمانؓ بن مقرن بھی شہید ہو گئے۔ نہاوند کی اس جنگ کو ''فتح الفتوح'' کہا جاتا ہے، یعنی ایسی فتح جو کئی فتوحات کے برابر ہو۔ نہاوند کی شکست نے ایرانیوں کی کمر توڑ دی اور وہ اس کے بعد کہیں بھی جم کر مقابلہ نہ کر سکے۔ اسلامی فوج کے مختلف دستے ایران کے مختلف حصوں کی طرف روانہ کر دیئے گئے جو چار پانچ سال کے اندر اندر پورے ایران کو اسلام کے سیاسی اقتدار کے تحت لے آئے۔

ایران کی فتح کے سلسلے میں جن مسلمان سپہ سالاروں نے نمایاں کارنامے انجام دیئے، ان میں حضرت احنفؓ بن قیس کا نام سب سے نمایاں ہے۔ جس طرح حضرت سعدؓ بن وقاص فاتح عراق کہلاتے ہیں، اسی طرح احنفؓ فاتح خراسان کہلاتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ خراسان فتح کیا، بلکہ ساسانی بادشاہ یزدگرد کو ایران کی حدود سے نکال باہر کیا۔ اور اس کام کو مکمل کر دیا جو حضرت خالد بن ولیدؓ نے شروع کیا تھا۔ اس طرح رسولِ کریم کی یہ پیشین گوئی پوری ہو گئی کہ ایران کی ساسانی سلطنت پارہ پارہ ہو جائے گی۔

یزدگرد کے ملک بدر ہونے کے بعد ایران کے مجوسیوں نے مسلمانوں سے صلح کر لی اور اکثر نے اسلام قبول کر لیا۔ حضرت احنفؓ نے جب حضرت عمرؓ کو ان فتوحات کی خبر دی تو حضرت عمرؓ نے مسلمانوں کو مسجد نبویؐ میں جمع کر کے خوشخبری سنائی اور کہا: ''آج مجوسیوں کی سلطنت برباد ہو گئی۔ اب ان کے ملک کی ایک چپہ زمین بھی ان کے قبضے میں نہیں کہ وہ مسلمانوں کو کسی قسم کا نقصان پہنچا سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی زمین، ان کا ملک اور ان کی دولت کا تم کو وارث بنایا ہے کہ وہ تم کو آزمائے۔ اس لئے تم اپنی حالت نہ بدلو ورنہ خدا بھی تمہاری جگہ دوسری قوم کو بدل دے گا۔ مجھ کو اس امت کے لئے خود اس کے افراد سے خوف ہے۔''

جنگِ جمل (656ء)

یہ مشہور جنگ بھی عراق ہی میں بصرہ کے قریب ہوئی۔ اس میں ایک طرف حضرت علیؓ تھے اور دوسری طرف حضرت عائشہؓ تھیں اور حضرت عائشہؓ کے ساتھ حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ اور حضرت زبیرؓ بن عوام تھے۔ اسے جنگِ جمل اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں حضرت عائشہؓ میدان جنگ میں عسکر نام ایک اونٹ پر سوار تھیں اور وہی لڑائی کا مرکز بن گیا تھا۔

جنگ کا سبب یہ تھا کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت عائشہؓ کو یہ اطلاع ملی کہ حضرت علیؓ کو خلیفہ منتخب کر لیا گیا ہے اور حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ کے قاتلوں کے ساتھ نرمی برت رہے ہیں۔ اس واقعہ نے خلفشار کی صورت اختیار کر لی۔ چنانچہ حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کی سرکردگی میں اصلاحِ احوال کی خاطر متعدد لوگ جمع ہو گئے، تاکہ قاتلوں سے انتقام لینے کی کوئی تدبیر نکالی جا سکے۔ چنانچہ حضرت علیؓ کو بھی اطلاع مل گئی، اور بصرہ کے مقام پر دونوں کے درمیان جھڑپیں ہوئیں۔ جمادی الثانی 36 ہجری میں صلح کرانے کے لئے مذاکرات شروع ہوئے، لیکن صلح ہونے کی بجائے جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت عائشہؓ اونٹ پر سوار تھیں۔ حضرت علیؓ نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اونٹ کو مار گرائیں۔ یہ حکم ملنے کے فوراً بعد ضبینہ نے اونٹ کے پاؤں پر تلوار کی ضرب لگائی، چنانچہ وہ بوکھلا اٹھا جس سے حضرت عائشہؓ کا لشکر تتر بتر ہو گیا۔ حضرت علیؓ نے اعلان کیا کہ جو شخص ہتھیار ڈال دے گا، اسے کوئی خطرہ نہیں۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ بھی کسی کے ساتھ زیادتی نہ کریں۔ حضرت علیؓ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کی مزاج پرسی کی

اور کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی خطا کو معاف فرمائے۔ حضرت عائشہؓ نے بھی ایسا ہی کہا۔ جنگِ جمل میں حضرت عائشہؓ کے نو ہزار اور حضرت علیؓ کے ایک ہزار ستر ساتھی کام آئے۔

جنگ صفین (657ء)

صفین عراق میں دریائے فرات کے مغربی کنارے پر رقہ کے جنوب میں ایک میدان ہے' جہاں امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے خلاف شدید جنگ شروع کی تھی۔ معمولی جھڑپیں تو مہینوں سے جاری تھیں۔ زبردست جنگ 8 صفر 37 ہجری/ 26 جولائی 657ء کو شروع ہوئی۔ حضرت علیؓ کی طرف سے مالک الاشتر نے زبردست حملہ کیا۔ جب امیر معاویہؓ کی فوج میں افراتفری پھیلی اور شکست کے آثار نمودار ہونے لگے تو امیر معاویہؓ نے دفعتہً قرآن مجید کی بنیاد پر فیصلے کی تجویز پیش کی' جسے حضرت علیؓ نے مسلمانوں میں خوں ریزی روکنے کی خیال سے منظور فرمایا۔ اس سلسلے میں ثالثی کے لئے "مجلسِ تحکیم" قائم ہوئی جس کا اجلاس اذرح کے مقام پر منعقد ہوا۔ (یہ اردن کا ایک مقام ہے جو معان اور شوبک کے درمیان پختہ سڑک پر واقع ہے۔ معان سے اس کا فاصلہ 16 میل ہے اور قبل از اسلام یہ رومیوں کی چھاؤنی تھی۔ ازرح آج بھی مدینہ منورہ اور دمشق کے درمیان کاروانی شاہراہ پر موجود ہے) اجلاس میں حضرت علیؓ کی طرف سے ابوموسیٰ اشعریؓ اور امیر معاویہؓ کی طرف سے عمرو بن العاصؓ نمائندے تھے' لیکن اس ثالثی کے فیصلے سے اتنی پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں کہ حضرت علیؓ نے فیصلہ مسترد کر دیا۔ آپ کے پیروؤں میں سے ایک گروہ ہے' جو خارجی کہلائے' قرآن ہی کو اساس بنا کر آپ سے علیحدگی اختیار کر لی اور مخالفت شروع کر دی۔

سانحہ کربلا (680ء)

امیر معاویہؓ نے اپنے بعد اپنے بڑے بیٹے یزید (679ء تا 684ء) کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ ان کے انتقال کے بعد جب یزید خلیفہ ہوا تو بہت سے لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ اس میں شک نہیں کہ امیر معاویہؓ نے بیٹے کی جانشینی کے مسئلے پر لوگوں سے مشورہ کر لیا تھا اور حج کے موقع پر ہزاروں افراد نے یزید کی بیعت بھی کی تھی' لیکن یہ بیعت دباؤ کے تحت کی گئی تھی۔ امیر معاویہؓ ہر حال میں اپنے بیٹے کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے اور اگر لوگ بیعت نہ کرتے' تب بھی وہ اپنے اس ارادے سے باز نہ آتے۔ یزید کی جانشینی پر بہت سے لوگوں نے مخالفت کی۔ پانچ ممتاز صحابہ کرامؓ نے کھل کر شدید مخالفت کی۔ ان کے نام یہ ہیں: حضرت حسین بن علیؓ' حضرت عبداللہ بن عمرؓ' حضرت عبداللہ بن عباسؓ' حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابوبکرؓ۔

مخالفت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ جانشینی کے اس طریقے کو' کہ باپ کے بعد بیٹا حکمران ہو' بادشاہت کا طریقہ سمجھتے تھے اور اسلامی طریقہ نہیں سمجھتے تھے' اور دوسری وجہ یہ تھی کہ یزید کو اخلاق اور کردار کے لحاظ سے اتنا اچھا نہیں سمجھتے تھے کہ اس کو مسلمانوں کا خلیفہ بنایا جائے۔ ان مخالفوں میں ایک رسول کریمؐ کے نواسے حضرت حسینؓ بھی تھے۔

یاد رہے کہ امیر معاویہؓ نے شام کے شہر دمشق کو دارالخلافہ قرار دیا تھا' جہاں وہ خلافت سے پہلے کئی سال سے گورنر کی حیثیت سے رہتے چلے آ رہے تھے۔ یہ شہر مدینہ اور کوفہ کے بعد اسلامی خلافت کا تیسرا دارالخلافہ تھا۔ کوفہ حضرت علیؓ کا دارالخلافہ تھا۔ جب یزید کی بیعت کا مسئلہ شدت اختیار کر گیا تو عراق میں کوفہ کے باشندوں نے حضرت حسینؓ کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور ان کو کوفہ آنے کی دعوت دی۔ اس موقع پر بعض صحابہؓ نے حضرت حسینؓ کو کوفہ جانے سے روکنا چاہا۔ ان میں آپ کے ایک سوتیلے بھائی محمد بن حنفیہ بھی تھے۔ لیکن حضرت حسینؓ نے ان مشوروں کو نظر انداز کر دیا اور کوفہ والوں کی دعوت پر اپنے خاندان کے بہتر آدمیوں کو ساتھ لے کر' جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے' مکہ سے کوفہ روانہ ہو گئے۔

اس دوران میں یزید نے عبیداللہ بن زیاد کو کوفہ کا عامل مقرر کر دیا۔ وہ بہت جابر اور سخت گیر تھا۔ جب وہ کوفہ پہنچ گیا تو کوفہ کے باشندے اس سے ڈر کر نہ صرف امام حسینؓ سے کئے ہوئے وعدوں سے پھر گئے' بلکہ امام حسینؓ کے نمائندے اور بھائی مسلم بن عقیل کو ابن زیاد کے سپرد کر دیا' جس نے انہیں قتل کرا دیا۔ کوفہ کے باشندوں کی اس روش سے مایوس ہو کر امام حسینؓ نے واپس مکہ جانا چاہا' لیکن حضرت مسلم کے بھائیوں کے اصرار پر امام حسینؓ سے سفر جاری رکھا۔

ابن زیاد کے چار ہزار آدمیوں نے دریائے فرات کے کنارے کربلا کے مقام پر اس قافلے کو گھیر لیا اور امام حسینؓ کو بیعت کرنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے ابن زیاد کے آدمیوں سے کہا کہ یا تو ان کو یزید کے پاس جانے دیا جائے' جہاں وہ خود اس سے معاملہ طے کر لیں گے یا پھر سرحد کی طرف نکل جانے دیا جائے' تاکہ وہ کفار سے جہاد کر سکیں یا ان کو واپس مدینہ جانے دیا جائے' لیکن ابن زیاد نے ان کی کوئی شرط منظور نہیں کی اور یزید کی بیعت پر مجبور کیا۔ لیکن امام حسینؓ ایسے انسان نہیں تھے جو موت سے ڈر کر اور دھمکی میں آ کر بات قبول کر لیتے۔ انہوں نے جان دینا قبول کر لیا' لیکن جبر اور زبردستی کے آگے جھکنا پسند نہیں کیا۔ مقابلہ بے جوڑ تھا۔ 72 آدمی چار ہزار آدمیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امام حسینؓ اور ان کے مرد ساتھی شہید ہو گئے۔ بالغ مردوں میں صرف ان کے فرزند امام زین العابدین زندہ بچے جو بیمار ہونے کی وجہ سے جنگ میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ ابن زیاد نے حضرت امام حسینؓ کا سر اور ان کے قافلے کے بچے کھچے افراد کو' جو عورتوں اور بچوں پر مشتمل تھا' یزید کے پاس دمشق روانہ کر دیا۔ دمشق اموی خلافت کا مرکز (41 ہجری تا 132 ہجری/ 661ء تا 750ء) یعنی کوئی 90 سال تک دارالخلافہ رہا۔

خلافت بنوعباس (750ء تا 1258ء)

جب خلافت بزورِ بازو بنوامیہ کو حاصل ہو گئی' تو اسی وقت بنوہاشم میں بھی دو گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ بنوہاشم کا تعلق چونکہ رسولِ کریمؐ کے خاندان سے تھا' اس لئے وہ خود کو خلافت کا بنوامیہ سے زیادہ مستحق سمجھتے تھے۔ ایک گروہ وہ جو حضرت علیؓ کو اور ان کے بعد ان کی اولاد کو خلافت کا حقدار سمجھتا تھا۔ یہ گروہ شیعان علیؓ کا طرفدار تھا۔ بعد میں اسی گروہ میں سے کچھ لوگوں نے شیعہ فرقے کی شکل اختیار کر لی اور اثنا عشری کہلائے۔ دوسرا گروہ رسول اللہؐ کے چچا حضرت عباسؓ کی اولاد کو خلافت دلانا چاہتا تھا۔ شروع میں دونوں گروہوں نے مل کر بنوامیہ کی حکومت کے خلاف بغاوتیں کیں' لیکن بعد میں عباسی گروہ غالب آ گیا۔

بنوامیہ کے آخری حکمران مروان ثانی (745 تا 750ء) کے عہد میں عباسی گروہ نے ایرانیوں کی مدد سے خراسان میں زبردست بغاوت کر دی۔ اس بغاوت میں ایک ایرانی سردار ابومسلم خراسانی سے عباسیوں کو بڑی مدد ملی۔ بنی ہاشم کا حامی یہ گروہ خراسان اور ایران پر قبضہ کرنے کے بعد عراق میں داخل ہو گیا' جہاں دریائے زاب کے کنارے مروان ثانی نے مقابلہ کیا' لیکن ایسی شکست فاش کھائی کہ راہِ فرار اختیار کرنی پڑی۔ بعد میں مروان پکڑا گیا اور اسے قتل کر دیا گیا۔ دارالخلافہ دمشق پر بنی ہاشم کا قبضہ ہو گیا اور بنوامیہ کی خلافت ختم ہو کر بنی ہاشم کی شاخ بنوعباس کی حکومت عراق میں قائم ہو گئی۔

عراق کو جو عروج خلافتِ عباسیہ کے عہد میں حاصل ہوا' وہ اسے پھر کبھی نصیب نہ ہو سکا۔ ابوالعباس سفاح پہلا عباسی خلیفہ ہے۔ اس کی حکومت کی مدت صرف چار سال ہے۔ یہ چار سال مخالفوں کو دبانے اور نئی حکومت کو مستحکم بنانے میں گزرا۔ سفاح نے عراق میں شہر انبار کو اپنا دارالخلافہ بنایا اور 752ء میں اس شہر کے قریب "ہاشمیہ" کے نام سے ایک نیا شہر تعمیر کیا۔

مورخین نے سفاح کی عقل' تدبر اور اخلاق کی تعریف کی ہے' لیکن اس کے ظلم و ستم نے تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا۔ اس کے دستِ راست ابومسلم خراسانی نے بنی امیہ کا اقتدار ختم کرنے میں چھ لاکھ انسان ہلاک کئے۔ دمشق فتح

کر کے عباسی فوجوں نے وہاں قتل عام کیا۔ امیر معاویہؓ سمیت تمام اموی حکمرانوں کی قبریں کھود ڈالی گئیں۔ ہشام بن عبدالملک کی لاش قبر میں صحیح سلامت ملی تو اس کو کوڑوں سے پیٹا گیا۔ بنی امیہ کا بچہ بچہ قتل کیا گیا اور اموی سرداروں کو تڑپتی لاشوں پر فرش بچھا کر کھانا کھلایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مورخین نے عبداللہ بن محمد ابوالعباس کو سفاح (خوں ریزی کرنے والا) کا لقب دیا ہے۔

ابوجعفر منصور (745ء۔775ء)

ابوالعباس سفاح اگرچہ پہلا عباسی خلیفہ ہے' لیکن عباسیوں کا پہلا نامور حکمران اس کا بھائی ابوجعفر منصور ہے جو سفاح کے بعد تختِ خلافت پر بیٹھا۔ منصور نے 22 سال حکومت کی اور خلافت عباسیہ کی جڑوں کو مضبوط کر دیا۔ وہ بڑا قابل حکمران تھا۔ وہ مخالفتوں کے ساتھ تو بڑی سختی کرتا تھا' لیکن عام رعایا کے لئے عادل تھا۔ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ جس کو کسی عامل سے تکلیف پہنچے' وہ بلا روک ٹوک اس سے شکایت کر سکتا ہے۔ وہ خود سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کی کنیز نے اس کے بدن پر پیوند لگے کپڑے دیکھ کر کہا: ''خلیفہ اور پیوند لگا ہوا کُرتا؟'' منصور نے اس کے جواب میں ایک شعر پڑھا' جس کا مطلب تھا: ''مرد اس حالت میں بھی عزت حاصل کر لیتا ہے کہ اس کی چادر پرانی اور قمیض میں پیوند لگے ہوں۔''

منصور کا یادگار کارنامہ بغداد کی بنیاد و تعمیر ہے۔ رسالت مآبؐ اور خلفائے راشدین کا دارالخلافہ مدینہ منورہ تھا۔ بنی امیہ کا دمشق' منصور نے بنوعباس کا دارالخلافہ بنانے کے لئے دریائے دجلہ کے کنارے ایک نیا شہر آباد کیا جو تاریخ میں بغداد کے نام سے مشہور ہوا۔

منصور کے عہد کا ایک اہم واقعہ ابومسلم خراسانی کا قتل ہے۔ عباسیوں کی حکومت قائم کرانے میں ابومسلم کا بہت بڑا بلکہ مرکزی کردار تھا' لیکن جب منصور نے یہ دیکھا کہ ابومسلم کا اثر رسوخ بڑھ گیا ہے اور اب اس کی ہمدردیاں حضرت عباسؓ کی اولاد سے زیادہ حضرت علیؓ کی اولاد کے ساتھ ہیں تو منصور نے ابومسلم کو دھوکا دے کر قتل کرا دیا۔

منصور کے عہدِ حکومت میں کئی بغاوتیں بھی ہوئیں اور حضرت علیؓ کی اولاد کی طرف سے خلافت حاصل کرنے کی کوششیں بھی ہوئیں۔ ان میں ایک کوشش محمد بن عبداللہ نفس ذکیہ نے (جو امام حسنؓ کی اولاد میں سے تھے) حجاز میں کی اور دوسری کوشش ان کے بھائی ابراہیم بن عبداللہ نے کی' لیکن منصور نے ان تمام بغاوتوں کو دبا دیا۔ منصور کے زمانے میں رومیوں سے پھر لڑائیاں شروع ہو گئیں' جن میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی اور منصور نے قیصرِ روم کو جزیہ دینے پر مجبور کر دیا۔

منصور کا دورِ خلافت علمی ترقی کے لحاظ سے بہت ممتاز ہے۔ بنی امیہ کے زمانے میں تعلیم زیادہ تر زبانی ہوتی تھی اور کتابیں لکھنے کا رواج زیادہ نہیں ہوا تھا۔ منصور کے دور میں تصنیف و تالیف کا کام باقاعدگی سے شروع ہو گیا۔ منصور کو خود بھی علم و ادب کی اشاعت سے دلچسپی تھی۔ اس کے دربار میں ہر علم و فن کے ماہر اور علماء جمع رہتے تھے۔ منصور پہلا خلیفہ ہے جس نے سریانی' یونانی' فارسی اور سنسکرت زبانوں کی کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ کرایا۔ یہ کتابیں عام طور پر ریاضی' طب' فلسفہ اور فلکیات سے متعلق تھیں۔ یہ وہ علوم تھے جن سے عربوں اور مسلمانوں کو پہلے واقفیت نہ تھی۔

منصور ہی کے عہدِ خلافت میں' لیکن دربار سے باہر' علمائے عصر نے بڑے بڑے علمی کام انجام دیئے۔ امام ابوحنیفہ نے فقہ اسلامی کو اسی دور میں تحریری صورت میں مرتب و مدون کیا۔ امام مالک نے حدیثِ نبویؐ کی مشہور زمانہ کتاب تحریری صورت میں مرتب کی۔ اور اسی عہد میں ابن اسحاق نے رسولِ کریمؐ کی پہلی مکمل سیرت و سوانح مرتب کی۔

محمد مہدی (775ء۔785ء)

منصور کے بعد اس کا بیٹا محمد مہدی خلیفہ ہوا۔ وہ اپنی طبیعت اور مزاج میں باپ سے بہت مختلف تھا۔ نرم دل' عیش پرست اور رنگین مزاج تھا' لیکن بدکردار نہیں تھا' فرض شناس تھا۔ اس نے ان تمام لوگوں کو جو سفاح اور منصور کے دور میں ظلم و ستم کا نشانہ بنے تھے' معاف کر دیا اور ظلم و جبر سے جو مال حاصل کیا گیا تھا' وہ بھی واپس کر دیا۔

مہدی کی حکم سے مکہ' مدینہ' یمن' بغداد اور دوسرے بڑے شہروں کے درمیان ڈاک قائم کی گئی۔ جس کی ترسیل اونٹوں اور خچروں سے ہوتی تھی۔ پوری مملکت میں کوڑھیوں کی دیکھ بھال کا سرکاری انتظام کیا گیا۔ مہدی نے خانہ کعبہ اور مسجد نبویؐ میں توسیع بھی کرائی۔

منصور کے دور میں دوسری زبانوں سے مختلف مذاہب کی کتابوں کے جو ترجمے کئے گئے تھے' ان کی وجہ سے مسلمانوں کے عقائد متاثر ہونا شروع ہو گئے تھے' اور ایک ایسا طبقہ پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا جو صرف ظاہری طور پر مسلمان تھا' لیکن در پردہ اسلام' اسلامی عقائد و شعائر میں گھن لگا رہا تھا۔ ان لوگوں کو مورخین نے ''زندیق'' لکھا ہے۔ مہدی نے زندیقیوں کے عقائد کی تردید اور اسلام کی تائید میں کتابیں لکھوائیں۔

مہدی کا دس سالہ دور اگرچہ امن و امان کا دور تھا' لیکن رومیوں سے سرحدی لڑائیاں اس دور میں بھی جاری رہیں۔ خلافت کی سرحدی فوجیں ہر سال موسم گرما میں ایشیائے کوچک کے رومی علاقوں پر حملے کرتی رہتی تھیں۔ ایسے ہی ایک حملے میں مسلمان فوجیں رومی دارالحکومت قسطنطنیہ تک پہنچ گئی تھیں اور رومی حکومت کو سالانہ خراج دینے کا وعدہ کر کے صلح کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس حملے کی قیادت مہدی کے بیٹے ہارون نے کی تھی جو بعد میں ہارون الرشید کے نام سے مشہور ہوا۔

موسیٰ ہادی (785ء۔786ء)

ہادی کے عہد میں امام حسنؓ کی اولاد میں ایک بزرگ ادریس حجاز سے نکل کر شمالی افریقہ کے اس حصے میں چلے گئے' جو آج کل المغرب یا مراکش کہلاتا ہے' اور یہاں ایک خودمختار حکومت کی بنیاد ڈالی جو ادریسی حکومت کہلاتی ہے۔ ادریسی حکومت 785ء میں قائم ہوئی اور 920ء تک قائم رہی۔ اس حکومت کا صدر مقام فاس تھا' جس کی بنیاد ادریس ہی نے ڈالی تھی۔ یہ حکومت بغداد کی عباسی خلافت کو تسلیم نہیں کرتی تھی' لیکن شیعہ بھی نہیں تھی۔ ادریس وفات کے بعد جس جگہ دفن ہوئے' وہ آج کل مولائے ادریس کہلاتی ہے اور مراکش کی ایک مقدس زیارت گاہ سمجھی جاتی ہے۔

ہارون الرشید (786ء۔809ء)

مہدی کے بعد اس کا لڑکا ہادی خلیفہ ہوا' لیکن سوا سال کی حکومت کے بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کا دوسرا بھائی ہارون تخت نشین ہوا۔ ہارون کی عمر اس وقت صرف 22 سال تھی۔ عباسی خلفاء میں سب سے زیادہ شہرت ہارون الرشید کو حاصل ہوئی۔ اس کا 23 سالہ عہد عباسی خلافت کا عہدِ زرین ہے۔ بغداد اپنے عروج پر تھا۔ کشادگی اور خوشحالی عام تھی اور علم و فن کا گھر گھر چرچا تھا۔ تمدن اور ثقافت کے لئے ہارون الرشید کا دور مثالی حیثیت رکھتا تھا۔

ہارون الرشید کی ذات میں متضاد اوصاف جمع تھے۔ ایک طرف اس کی زندگی عیش پرستانہ تھی' تو دوسری طرف وہ بڑا دین دار' پابندِ شریعت اور علم دوست تھا۔ روزانہ سو رکعت نفل پڑھتا اور ایک ہزار درہم غریبوں میں خیرات کرتا تھا۔ اسے جہاد کا شوق اور شہادت کی تمنا تھی۔ وہ ایک سال حج کرتا اور ایک سال جہاد۔ جس سال حج کو جاتا تو ایک سو علماء کو ہمراہ لے جاتا اور ان کا خرچ خود ادا کرتا' اور جس سال حج کو نہ جاتا تو تین سو علماء کو اپنی طرف سے حج کرنے کے لئے بھیجتا۔ علماء اور نیک و متقی بزرگوں کا بڑا احترام کرتا تھا' اور جب وہ اس کی کوتاہیوں پر تنقید یا ملامت کرتے تو وہ برا نہ مانتا اور اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لیتا تھا۔

خلیفہ ہارون الرشید کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس' سپریم کورٹ) قاضی ابویوسف تھے۔ سلطنت میں تمام قاضیوں کا تقرر وہی کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے عدالتوں سے خوب انصاف ہوتا تھا۔ قاضی صاحب ہارون الرشید تک کے خلاف فیصلہ دے دیتے تھے۔ ہارون نے قاضی

صاحب سے محصولات کے نظام پر ایک تصنیف ''کتاب الخراج'' لکھوائی تھی' جسے اسلامی معاشیات میں کلاسیک کا درجہ حاصل ہے۔

دنیا کی دوسری زبانوں کی اعلیٰ کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے کے جس کام کا بیڑا منصور نے اٹھایا تھا' ہارون نے اسے مزید ترقی دی اور اس مقصد کے لئے ''بیت الحکمت'' کے نام سے ایک عظیم الشان ادارہ قائم کیا جس میں کام کرنے والے عالموں اور مترجموں کو گراں قدر تنخواہیں دی جاتی تھیں۔

رومیوں سے مسلمانوں کی چونکہ مسلسل لڑائیاں رہتی تھیں' اس لئے ہارون الرشید نے اسلامی مملکت کو رومیوں کے اچانک حملوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ایشیائے کوچک کی سرحدوں پر قلعہ بندیاں کیں اور شام کے ساحل کے ساتھ ساتھ چھاؤنیاں قائم کیں۔ اس سلسلے میں ہارون الرشید کا حملۂ روم تاریخ کا بڑا اہم واقعہ ہے۔ رومی بادشاہ عباسی خلافت کی اطاعت کرتے تھے اور باقاعدہ خراج ادا کرتے تھے۔ ہارون الرشید کے زمانے میں رومی بادشاہ نقفور نے نہ صرف خراج دینے سے انکار کر دیا' بلکہ پچھلے برسوں میں ادا کردہ خراج بھی واپس کرنے کا مطالبہ کیا۔ ہارون نے جب یہ خط دیکھا تو غصے سے سرخ ہو گیا اور اس نے جواب میں لکھا: ''اے رومی کتے! تو اس کا جواب سنے گا نہیں' بلکہ آنکھوں سے دیکھے گا۔''

یہ جواب بھیج کر ہارون ایک زبردست فوج لے کر حملہ آور ہوا اور رومیوں کو ایسی شکست دی کہ وہ پھر خراج ادا کرنے لگے۔ اس مہم کے دوران ہارون نے ترکی کے شہر انقرہ اور قونیہ بھی فتح کر لئے تھے۔

امین الرشید (809ء تا 813ء)

جانشینی کے معاملے میں اب تک یہ قاعدہ تھا کہ ایک خلیفہ کے انتقال کے بعد ایک ہی خلیفہ تخت نشین ہوتا تھا' لیکن ہارون الرشید نے یہ طریقہ بدل دیا اور سلطنت اپنے دو بیٹوں امین اور مامون میں تقسیم کر دی۔ امین کو مغربی ایران' عراق اور افریقہ تک تمام مغربی ملک دے دیئے اور مامون الرشید کو ایران کا بڑا حصہ اور دریائے سندھ تک تمام مشرقی ملک مل گئے۔ ہارون کی وفات کے بعد مامون الرشید نے خراسان کے شہر مرو کو اور امین نے بغداد کو دارالخلافہ بنالیا۔

ہارون الرشید جیسے عقل مند بادشاہ کی یہ بہت بڑی غلطی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر اپنی مضبوط و مستحکم سلطنت کو دو حصوں میں تقسیم کر کے کمزور کر دیا۔ مثل مشہور ہے کہ ایک ملک میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے۔ چنانچہ امین اور مامون میں جلد ہی لڑائی شروع ہو گئی' جس میں بڑی خوں ریزی ہوئی اور کئی سال تک عراق میں بدامنی رہی۔ اس خانہ جنگی میں مامون کو کامیابی ہوئی۔ اس طرح عباسی سلطنت پارہ پارہ ہونے سے بچ گئی۔ اگر مامون الرشید سلطنت کو پھر سے متحد کرنے میں کامیاب نہ ہوتا تو عباسیوں کا زوال پچاس سال پہلے ہی شروع ہو جاتا۔

مامون الرشید (813ء تا 833ء)

امین الرشید کے قتل ہونے کے بعد بھی مامون الرشید تقریباً چھ سال تک مرو ہی میں رہا۔ اس زمانے میں عراق خصوصاً بغداد شہر ہنگاموں کی نذر ہو گیا۔ ان ہنگاموں کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مامون الرشید اپنے شیعہ اتالیق اور نگرانوں کے اثر سے حضرت علیؓ کی فضیلت کا قائل ہو گیا تھا اور حضرت علیؓ کی اولاد کو خلافت کا زیادہ حقدار سمجھنے لگا تھا۔ اس معاملے میں وہ یہاں تک بڑھا کہ اس نے امام علی بن موسیٰ رضا کو جو شیعوں کے آٹھویں امام ہیں اپنا ولی عہد مقرر کر دیا۔ اس فیصلے نے عباسیوں میں اضطراب پیدا کر دیا اور انہوں نے عراق میں بغاوت کر دی۔ مامون الرشید کو بالآخر اپنا فیصلہ منسوخ کرنا پڑا اور مرو چھوڑ کر بغداد آنا پڑا۔ 818ء میں بغداد پہنچنے کے بعد ہنگامے فرو ہو گئے اور خلیفہ مامون الرشید کے باقی پندرہ سال امن و امان میں گزرے۔

مامون کے عہد کا ایک اہم واقعہ جزیرہ صقلیہ (سسلی) اور جزیرہ کریٹ کی فتح ہے۔ صقلیہ قیروان کے اغلبی حکمرانوں کی کوششوں سے فتح ہوا جو عباسی خلافت کے باج گزار تھے اور کریٹ کا جزیرہ اندلس سے نکلی ہوئی مسلمانوں کی ایک جماعت نے فتح کیا۔ ان کے دور کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس عہد میں ترکوں میں اسلام تیزی سے پھیلنا شروع ہوا۔ افغانستان اور کابل کے لوگوں نے بھی اسی زمانے میں اسلام قبول کیا۔

مامون عادات و اطوار کے اعتبار سے اپنے باپ ہارون کی طرح تھا' بلکہ زیادہ ہمدرد اور نرم دل تھا۔ فیاض اور سخی بھی ہارون سے زیادہ تھا۔ عدل و انصاف کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ ہر اتوار کو فجر سے ظہر تک رعایا کی شکایات سنتا تھا۔ اس کی عدالت میں ایک معمولی آدمی بھی شہزادوں تک سے اپنا حق لے سکتا تھا۔ اس کے مزاج میں حد سے زیادہ سادگی اور انکساری تھی۔ غرور اور تکبر کا نام بھی نہ تھا۔ اپنے ساتھیوں اور درباریوں میں نہایت سادگی اور بے تکلفی سے رہتا تھا۔ اسے حکومت کے نظم و نسق کا بہت خیال رہتا تھا۔ اپنی وسیع سلطنت کی ہر چیز اور کام سے واقف رہنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے سارے ملک میں پرچہ نویس مقرر کر رکھے تھے جو ذرا ذرا سی بات کی اطلاع خلیفہ کو دیتے تھے۔ صرف بغداد شہر میں اس کام کے لئے 1700 خواتین تعینات تھیں جو اسے خفیہ اطلاعات بہم پہنچاتی تھیں۔

علوم و فنون کی ترویج و ترقی کے لئے مامون الرشید کی کوششیں تاریخ انسانیت کا زرین باب ہیں۔ وہ خود بھی بڑا عالم اور فاضل تھا۔ خلفاء میں اس کے برابر کوئی دوسرا عالم نہیں ہوا۔ وہ حافظ قرآن تھا۔ دینی علوم سے گہری واقفیت کے علاوہ ریاضی اور فلکیات سے گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے ریاضی اور فلکیات کے ماہرین کی مدد سے دو مرتبہ کرۂ زمین کی پیمائش کرائی۔ غیر زبانوں سے ترجمے کا کام اس کے عہد میں اپنے عروج پر پہنچ گیا۔ وہ مترجمین کو ان کی ترجمہ شدہ کتاب کے وزن کے برابر سونا یا چاندی انعام میں دیا کرتا تھا۔ افلاطون' سقراط' ارسطو' جالینوس' اقلیدس اور بطلیموس کی تصانیف کے ''بیت الحکمت'' کے زیر اہتمام عربی میں تراجم کرائے۔

مامون الرشید کے عہد کا ایک اہم اور قابل ذکر واقعہ ''فتنۂ خلق قرآن'' ہے۔ یونانی فلسفے کے مطالعے اور غیر مسلم' بالخصوص یہودی علماء کی صحبت سے مامون الرشید تشکیک میں پڑ کر اس عقیدے کا قائل ہو گیا تھا کہ قرآن مخلوق ہے۔ اس نظریئے کی صداقت پر مامون کو اس حد تک یقین تھا کہ اپ نے خلق قرآن کے عقیدے کو اسلام اور کفر کے درمیان حد فاصل سمجھ لیا تھا۔ انہوں نے علماء کو مجبور کیا کہ یا تو وہ اس نظریئے کو تسلیم کریں' یا پھر سزا بھگتنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اب تک آزادئ رائے پر پابندی صرف سیاسی معاملات کی حد تک تھی' لیکن مامون جیسے سمجھدار اور صاحب علم حکمران نے خلق قرآن کے مسئلے میں شدت اختیار کر کے مذہبی آزادی میں بھی مداخلت کر دی۔ مامون الرشید کا تو جلد ہی انتقال ہو گیا' لیکن اس کے دو جانشینوں معتصم اور واثق کے زمانے میں اس مسئلے کی وجہ سے علماء پر اور خاص طور پر امام احمد بن حنبل پر بہت جبر و تشدد کیا گیا۔ مامون الرشید 48 سال کی عمر میں فوت ہوا۔ اس نے بیس سال حکومت کی۔

معتصم باللہ (833ء تا 842ء)

مامون کے بعد اس کا بھائی معتصم باللہ تخت پر بیٹھا۔ اس کے عہد میں عسکری طاقت میں بڑا اضافہ ہوا' اور اس نے اس مقصد کے لئے ترکوں کی فوج تیار کی۔ معتصم کے عہد کا سب سے مشہور واقعہ روم پر کامیاب حملہ ہے۔ دوسرا اہم واقعہ بابک خرمی کی بغاوت کا خاتمہ ہے۔ بابک خرمی ایک غیر مسلم ایرانی تھا اور اس نے ایک ایسی تحریک شروع کی تھی' جس کا مقصد مسلمانوں کو گمراہ اور بے دین کرنا تھا۔ اس اسلام دشمن تحریک کے ذریعے اس نے بہت سے ایرانیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور گیلان اور آذربائیجان کے پہاڑی علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ بابک خرمی کی یہ بغاوت خلیفہ مامون الرشید کے زمانے ہی میں شروع ہو گئی

تھی۔ اسے بالآخر معتصم نے فرو کیا۔ بابک خرمی گرفتار ہو کر قتل ہوا۔

معتصم نے بغداد سے شمال میں تقریباً 75 میل کے فاصلے پر دریائے دجلہ کے کنارے پر ''سامرا'' کے نام سے ایک شہر بسایا اور اسے دارالخلافہ بنایا۔ اس شہر نے بڑی ترقی کی اور اپنی شاندار عمارتوں اور خوبصورتی میں بغداد کا مقابلہ کرنے لگا۔ سامرا 835ء سے 892ء تک دارالخلافہ رہا۔ اس کے بعد دارالخلافہ پھر بغداد منتقل ہو گیا۔

متوکل علی اللہ (847ء تا 861ء)

معتصم کے بعد اس کا لڑکا واثق اور اس کے بعد دوسرا لڑکا متوکل تخت خلافت پر بیٹھا۔ اس کا دور خلافت عباسیہ کے عروج کا آخری دور ہے۔ اس کی عہد میں خوشحالی عام تھی اور چیزیں باافراط' بہت ارزاں قیمت پر ملتی تھیں۔ وہ طبیعت کا بھی نرم تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ مجھ سے پہلے کے خلفاء رعایا پر اس لئے سختی کرتے تھے کہ وہ اس سختی کی وجہ سے ان کے فرماں بردار رہیں' لیکن میں نرمی کرتا ہوں' تاکہ رعایا مجھ سے محبت کرے۔ متوکل نے فتنہ خلق قرآن کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور اس قسم کے مناظروں اور مباحثوں پر پابندی عائد کر دی۔

بادشاہ کے اندر جو خودسری اور اپنی بات منوانے کا زعم ہوتا ہے' وہ متوکل میں بھی تھا۔ اس کا اظہار اس نے خاصے غیر مہذب انداز میں کیا۔ متوکل حضرت علیؓ کی اولاد کی طرف سے ہمیشہ بغاوت کا خطرہ محسوس کرتا رہتا تھا۔ اسی طرح رومیوں سے مسلسل سرحدی لڑائیوں کی وجہ سے وہ مملکت کی عیسائی آبادی کو بھی شک و شبے کی نظر سے دیکھتا تھا۔ آلؓ علی سے متعلق اس نے اپنے جذبے کا اظہار اس طرح کیا کہ کربلا میں حضرت امام حسینؓ کا مزار ڈھا دیا' اور عیسائیوں سے متعلق اس نے اپنے جذبے کا اظہار ان پر بعض پابندیاں عائد کر کے کیا۔ ان میں ایک پابندی یہ تھی کہ وہ مخصوص لباس پہنا کریں۔

پہلے عروج کا زوال

متوکل خلافت عباسیہ کے پہلے عہد عروج کا آخری حکمران تھا۔ اس کے بعد عباسی خلافت کا زوال شروع ہو گیا اور عباسیوں کی وسیع و عریض سلطنت رفتہ رفتہ کمزور اور محدود ہوتی چلی گئی۔

بنو عباس کا زوال اس وجہ سے نہیں ہوا کہ ان کے حکمران نااہل تھے۔ عباسیوں کے دور زوال میں بھی کئی ایسے حکمران نظر آتے ہیں جو بیدار مغز اور لائق تھے۔ ان کے زوال کی بڑی وجہ ترکوں کا اقتدار تھا جو معتصم کے زمانے سے بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ عباسی حکومت کے قیام میں چونکہ ایرانیوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا' اس لئے حکومت پر ان کا اثر شروع ہی سے موجود تھا۔ وزیر اور دوسرے اعلیٰ عہدے دار عام طور پر ایرانی ہوتے تھے۔ مامون الرشید کے بعد خاص طور پر ایرانی اثر بہت بڑھ گیا تھا۔ خلافت کی مضبوطی کے لئے یہ بات بہت اچھی تھی کہ عرب اور ایرانی ایک دوسرے سے لڑنے کی بجائے اب خلافت کے استحکام میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔ اس تعاون کو اخوت اور مساوات کی بنیاد پر مزید فروغ دیا جا سکتا تھا' لیکن دربار سے اسلامی روح اور اسلامی نظریات و عقائد کو اسی وقت رخصت کیا جا چکا تھا' جب خلافت کی جگہ ملوکیت قائم ہوئی تھی۔ اب سیاست کی بنیاد ملت اسلامیہ کے مفاد کی بجائے حکمران کی ذاتی مصلحت ہوتی تھی۔ عباسیوں نے ابتدائی دور میں اسی ذاتی مصلحت کے تحت ایرانیوں کو آگے بڑھایا اور اب معتصم نے اسی ذاتی مصلحت کے تحت ایرانیوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے خائف ہو کر ترکوں کو آگے بڑھایا۔

خلافت عباسیہ کے زمانے میں ترکوں نے بڑی تیزی سے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ معتصم نے اپنے ذاتی محافظ کے طور پر اور فوج کے لئے مشرقی سرحدوں سے ہزاروں کی تعداد میں ترکوں کو بھرتی کیا۔ ترک چونکہ فطری طور پر جنگجو اور دلیر ہوتے تھے' اس لئے وہ جلد ہی فوجی نظام پر چھا گئے۔ متوکل کے عہد میں ان کا زور اتنا بڑھ گیا کہ وہ امور سلطنت میں مداخلت کرنے لگے اور آخر کار خود متوکل ان کی سازش کا شکار ہو کر قتل ہوا۔ ترک فوجی اور ان کی افسروں میں سب مسلمان نہیں تھے۔ ان کی خاصی بڑی تعداد اب تک غیر مسلم تھی۔ وہ غیر تربیت یافتہ اور اجڈ تھے۔ ان کے اسی اجڈ پن کی وجہ سے معتصم کو بغداد چھوڑ کر ''سامرا'' منتقل ہونا پڑا تھا۔ ان میں جو مسلمان تھے' ان کی صحیح معنوں میں اسلامی تعلیم و تربیت بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ نظریاتی طور پر اتنے پختہ مسلمان بھی نہیں تھے' جتنے ایرانی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب حکمرانوں اور ایرانی امراء اور وزراء کی طرح یہ ترک بھی ہر بات ملت اسلامیہ کے مفاد کے بجائے ترکوں کے مفاد میں سوچنے لگے اور اس طرح اسلامی خلافت کے عرب' ایرانی اور ترک باشندے بلند اسلامی مشن کو نظر انداز کر کے اپنی اپنی نسل اور اپنے اپنے وطن کی بنیاد پر ایک دوسرے سے متصادم ہو گئے۔

متوکل کے بعد ترک امراء کا اقتدار اور بڑھ گیا۔ اب وہ خلیفہ کا حکم سننے سے بھی انکار کرنے لگے۔ انہوں نے کئی خلفاء کو تخت سے اتار دیا اور بعض کو قتل بھی کیا۔ متوکل کے بعد آٹھ سال کی مختصر مدت میں چار خلفاء تخت پر بٹھائے اور اتارے گئے۔ اس طرح ترکوں نے مرکزی حکومت کو کمزور تو کر دیا' لیکن خود کوئی مضبوط حکومت قائم نہ کر سکے۔ جب سلطنت کے مختلف صوبوں نے یہ حالت دیکھی تو وہاں کے امیروں اور صوبیداروں نے اپنے اپنے علاقے میں خودمختار حکومتیں قائم کر لیں۔ یہ حکومتیں عباسی خلیفہ کو تسلیم تو کرتی تھیں۔ ان کی مسجدوں میں عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا' لیکن عباسی خلیفہ کا کوئی حکم نہیں چلتا تھا (ان خودمختار حکومتوں کا ذکر آگے آ رہا ہے)

زوال کے اس دور میں جو اہم واقعات پیش آئے' ان میں دو قابل ذکر ہیں۔ ایک واقعہ حبشیوں کی بغاوت کا ہے۔ عربوں کے پاس جو غلام تھے' وہ زیادہ تر حبشی تھے۔ ایک ایرانی نے ان حبشی غلاموں کی مدد سے عراق میں ہنگامہ شروع کر دیا۔ حبشیوں کی تعداد عراق میں کافی تھی۔ وہ سب اس کے ساتھ مل گئے۔ ان حبشیوں نے جنوبی عراق اور خوزستان پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں پر بڑے مظالم کئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاتھ سے 25 لاکھ بے گناہ شہری مارے گئے۔ یہ بغاوت پندرہ سال (868ء تا 883ء) جاری رہی۔

دوسرا اہم واقعہ قرامطہ کا فتنہ ہے۔ بصرہ کے نواح میں ایک شخص قرمط نے عراق کی بدامنی سے فائدہ اٹھا کر ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی' جس کے پیرو قرامطہ کہلاتے ہیں۔ قرامطہ کے فتنے کا آغاز ہوا اور پچاس سال سے زیادہ جاری رہا۔ جنوبی عراق اور شام ان کے ظلم و ستم اور لوٹ مار کا سب سے زیادہ نشانہ بنے۔ یہ لوگ یہاں تک بڑھ گئے تھے کہ 890ء میں حج کے موقع پر مکہ میں حاجیوں کا قتل عام کیا اور حجر اسود اٹھا کر اپنے دارالحکومت ہجر لے گئے جو بصرہ کے جنوب میں واقع تھا۔ بعد میں فاطمی حکمران عبیداللہ کے حکم پر حجر اسود واپس کر دیا۔

دور زوال میں جس خلیفہ نے سب سے زیادہ خدمات انجام دیں' وہ موفق کا لڑکا معتضد ہے جو معتمد کے بعد خلیفہ ہوا۔ اس نے ترکوں کا زور توڑ دیا۔ ایک وسیع علاقے میں جو عراق' ایران اور آرمینیا پر مشتمل تھا۔ پھر سے امن و امان قائم کر دیا اور عباسی حکومت کو گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا۔ اس کے عہد میں مصر و شام کی طولانی حکومت نے بھی عباسی خلافت کی اطاعت قبول کر لی اور اس کے جانشین مکتفی کے زمانے میں مصر و شام براہ راست عباسی خلافت کے قبضے میں آ گئے۔

معتضد نے امن و امان قائم کرنے کے سلسلے میں کافی سختیاں کیں' لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے مسلمانوں کی اخلاقی و ذہنی اصلاح کی بھی کوشش کی۔ وہ ذاتی طور پر دین دار انسان تھا۔ اس نے نجومیوں اور قصہ گویوں کو سڑکوں پر بیٹھنے سے منع کر دیا۔ فلسفے کی کتابوں پر' جو مسلمانوں میں گمراہی پھیلا رہی تھیں' پابندی لگا دی۔ ایرانی آتش پرستوں کے زیر اثر بعض مسلمانوں میں بھی نوروز کے موقع پر آگ جلانے کی رسم رواج پا گئی تھی' معتضد نے اس رسم کو

تھی۔ اسے بالآخر معتصم نے فرو کیا۔ بابک خرمی گرفتار ہو کر قتل ہوا۔

معتصم نے بغداد سے شمال میں تقریباً 75 میل کے فاصلے پر دریائے دجلہ کے کنارے پر ''سامرا'' کے نام سے ایک شہر بسایا اور اسے دارالخلافہ بنایا۔ اس شہر نے بڑی ترقی کی اور اپنی شاندار عمارتوں اور خوبصورتی میں بغداد کا مقابلہ کرنے لگا۔ سامرا 835ء سے 892ء تک دارالخلافہ رہا۔ اس کے بعد دارالخلافہ پھر بغداد منتقل ہو گیا۔

متوکل علی اللہ (847ء تا 861ء)

معتصم کے بعد اس کا لڑکا واثق اور اس کے بعد دوسرا لڑکا متوکل تخت خلافت پر بیٹھا۔ اس کا دور خلافت عباسیہ کے عروج کا آخری دور ہے۔ اس کی عہد میں خوشحالی عام تھی اور چیزیں باافراط' بہت ارزاں قیمت پر ملتی تھیں۔ وہ طبیعت کا بھی نرم تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ مجھ سے پہلے کے خلفاء رعایا پر اس لئے سختی کرتے تھے کہ وہ اس سختی کی وجہ سے ان کے فرماں بردار رہیں' لیکن میں نرمی کرتا ہوں' تاکہ رعایا مجھ سے محبت کرے۔ متوکل نے فتنۂ خلق قرآن کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور اس قسم کے مناظروں اور مباحثوں پر پابندی عائد کر دی۔

بادشاہ کے اندر جو خودسری اور اپنی بات منوانے کا زعم ہوتا ہے' وہ متوکل میں بھی تھا۔ اس کا اظہار اس نے خاصے غیر مہذب انداز میں کیا۔ متوکل حضرت علیؓ کی اولاد کی طرف سے ہمیشہ بغاوت کا خطرہ محسوس کرتا رہتا تھا۔ اسی طرح رومیوں سے مسلسل سرحدی لڑائیوں کی وجہ سے وہ مملکت کی عیسائی آبادی کو بھی شک وشبے کی نظر سے دیکھتا تھا۔ آلؓ علی سے متعلق اس نے اپنے جذبے کا اظہار اس طرح کیا کہ کربلا میں حضرت امام حسینؓ کا مزار ڈھا دیا' اور عیسائیوں سے متعلق اس نے اپنے جذبے کا اظہار ان پر بعض پابندیاں عائد کر کے کیا۔ ان میں ایک پابندی یہ تھی کہ وہ مخصوص لباس پہنا کریں۔

پہلے عروج کا زوال

متوکل خلافتِ عباسیہ کے پہلے عہد عروج کا آخری حکمران تھا۔ اس کے بعد عباسی خلافت کا زوال شروع ہو گیا اور عباسیوں کی وسیع وعریض سلطنت رفتہ رفتہ کمزور اور محدود ہوتی چلی گئی۔

بنوعباس کا زوال اس وجہ سے نہیں ہوا کہ ان کے حکمران نااہل تھے۔ عباسیوں کے دورِ زوال میں بھی کئی ایسے حکمران نظر آتے ہیں جو بیدار مغز اور لائق تھے۔ ان کے زوال کی بڑی وجہ ترکوں کا اقتدار تھا جو معتصم کے زمانے سے بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔ عباسی حکومت کے قیام میں چونکہ ایرانیوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا' اس لئے حکومت پر ان کا اثر شروع ہی سے موجود تھا۔ وزیر اور دوسرے اعلیٰ عہدے دار عام طور پر ایرانی ہوتے تھے۔ مامون الرشید کے بعد خاص طور پر ایرانی اثر بہت بڑھ گیا تھا۔ خلافت کی مضبوطی کے لئے یہ بات بہت اچھی تھی کہ عرب اور ایرانی ایک دوسرے سے لڑنے کی بجائے اب خلافت کے استحکام میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔ اس تعاون کو اخوت اور مساوات کی بنیاد پر مزید فروغ دیا جا سکتا تھا' لیکن دربار سے اسلامی روح اور اسلامی نظریات وعقائد کو اسی وقت رخصت کیا جا چکا تھا' جب خلافت کی جگہ ملوکیت قائم ہوئی تھی۔ اب سیاست کی بنیاد ملت اسلامیہ کے مفاد کی بجائے حکمران کی ذاتی مصلحت ہوتی تھی۔ عباسیوں نے ابتدائی دور میں اسی ذاتی مصلحت کے تحت ایرانیوں کو آگے بڑھایا اور اب معتصم نے اسی ذاتی مصلحت کے تحت ایرانیوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے خائف ہو کر ترکوں کو آگے بڑھایا۔

خلافتِ عباسیہ کے زمانے میں ترکوں نے بڑی تیزی سے اسلام قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ معتصم نے اپنے ذاتی محافظ کے طور پر اور فوج کے لئے مشرقی سرحدوں سے ہزاروں کی تعداد میں ترکوں کو بھرتی کیا۔ ترک چونکہ فطری طور پر جنگجو اور دلیر ہوتے تھے' اس لئے وہ جلد ہی فوجی نظام پر چھا گئے۔ متوکل کے عہد میں ان کا زور اتنا بڑھ گیا کہ وہ امورِ سلطنت میں مداخلت کرنے لگے اور آخر کار خود متوکل ان کی سازش کا شکار ہو کر قتل ہوا۔ ترک فوجی اور ان کی افسروں میں سب مسلمان نہیں تھے۔ ان کی خاصی بڑی تعداد اب تک غیر مسلم تھی۔ وہ غیر تربیت یافتہ اور اجڈ تھے۔ ان کے اسی اجڈ پن کی وجہ سے معتصم کو بغداد چھوڑ کر ''سامرا'' منتقل ہونا پڑا تھا۔ ان میں جو مسلمان تھے' ان کی صحیح معنوں میں اسلامی تعلیم وتربیت بھی نہیں ہوئی تھی اور وہ نظریاتی طور پر اتنے پختہ مسلمان بھی نہیں تھے' جتنے ایرانی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب حکمرانوں اور ایرانی امراء اور وزراء کی طرح یہ ترک بھی ہر بات ملتِ اسلامیہ کے مفاد کے بجائے ترکوں کے مفاد میں سوچنے لگے اور اس طرح اسلامی خلافت کے عرب' ایرانی اور ترک باشندے بلند اسلامی مشن کو نظر انداز کر کے اپنی اپنی نسل اور اپنے اپنے وطن کی بنیاد پر ایک دوسرے سے متصادم ہو گئے۔

متوکل کے بعد ترک امراء کا اقتدار اور بڑھ گیا۔ اب وہ خلیفہ کا حکم سننے سے بھی انکار کرنے لگے۔ انہوں نے کئی خلفاء کو تخت سے اتار دیا اور بعض کو قتل بھی کیا۔ متوکل کے بعد آٹھ سال کی مختصر مدت میں چار خلفاء تخت پر بٹھائے اور اتارے گئے۔ اس طرح ترکوں نے مرکزی حکومت کو کمزور تو کر دیا' لیکن خود کوئی مضبوط حکومت قائم نہ کر سکے۔ جب سلطنت کے مختلف صوبوں نے یہ حالت دیکھی تو وہاں کے امیروں اور صوبیداروں نے اپنے اپنے علاقے میں خودمختار حکومتیں قائم کر لیں۔ یہ حکومتیں عباسی خلیفہ کو تسلیم تو کرتی تھیں۔ ان کی مسجدوں میں عباسی خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا' لیکن عباسی خلیفہ کا کوئی حکم نہیں چلتا تھا (ان خودمختار حکومتوں کا ذکر آگے آ رہا ہے)

زوال کے اس دور میں جو اہم واقعات پیش آئے' ان میں دو قابل ذکر ہیں۔ ایک واقعہ حبشیوں کی بغاوت کا ہے۔ عربوں کے پاس جو غلام تھے' وہ زیادہ تر حبشی تھے۔ ایک ایرانی نے ان حبشی غلاموں کی مدد سے عراق میں ہنگامہ شروع کر دیا۔ حبشیوں کی تعداد عراق میں کافی تھی۔ وہ سب اس کے ساتھ مل گئے۔ ان حبشیوں نے جنوبی عراق اور خوزستان پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں پر بڑے مظالم کئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے ہاتھ سے 25 لاکھ بے گناہ شہری مارے گئے۔ یہ بغاوت پندرہ سال (868ء تا 883ء) جاری رہی۔

دوسرا اہم واقعہ قرامطہ کا فتنہ ہے۔ بصرہ کے نواح میں ایک شخص قرمط نے عراق کی بدامنی سے فائدہ اٹھا کر ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی' جس کے پیرو قرامطہ کہلاتے ہیں۔ قرامطہ کے فتنے کا آغاز ہوا اور پچاس سال سے زیادہ جاری رہا۔ جنوبی عراق اور شام ان کے ظلم وستم اور لوٹ مار کا سب سے زیادہ نشانہ بنے۔ یہ لوگ یہاں تک بڑھ گئے تھے کہ 890ء میں حج کے موقع پر مکہ میں حاجیوں کا قتل عام کیا اور حجرِ اسود اٹھا کر اپنے دارالحکومت ہجر لے گئے جو بصرہ کے جنوب میں واقع تھا۔ بعد میں فاطمی حکمران عبیداللہ کے حکم پر حجرِ اسود واپس کر دیا۔

دورِ زوال میں جس خلیفہ نے سب سے زیادہ خدمات انجام دیں' وہ موفق کا لڑکا معتضد ہے جو معتمد کے بعد خلیفہ ہوا۔ اس نے ترکوں کا زور توڑ دیا۔ ایک وسیع علاقے میں جو عراق' ایران اور آرمینیا پر مشتمل تھا۔ پھر سے امن وامان قائم کر دیا اور عباسی حکومت کو گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دیا۔ اس کے عہد میں مصر وشام کی طولانی حکومت نے بھی عباسی خلافت کی اطاعت قبول کر لی اور اس کے جانشین مکتفی کے زمانے میں مصر وشام براہ راست عباسی خلافت کے قبضے میں آ گئے۔

معتضد نے امن وامان قائم کرنے کے سلسلے میں کافی سختیاں کیں' لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے مسلمانوں کی اخلاقی وذہنی اصلاح کی بھی کوشش کی۔ وہ ذاتی طور پر دین دار انسان تھا۔ اس نے نجومیوں اور قصہ گویوں کو سڑکوں پر بیٹھنے سے منع کر دیا۔ فلسفے کی کتابوں پر' جو مسلمانوں میں گمراہی پھیلا رہی تھیں' پابندی لگا دی۔ ایرانی آتش پرستوں کے زیر اثر بعض مسلمانوں میں بھی نوروز کے موقع پر آگ جلانے کی رسم رواج پا گئی تھی' معتضد نے اس رسم کو

اور مصر میں گزرا اور آخر میں مصر ہی میں وفات پائی۔ امام شافعی کے فقہ کی اشاعت ان جلیل القدر علماء کی کوششوں کا نتیجہ ہے جو پانچ سو سال تک مصر' عرب' شام' عراق او ایران میں پیدا ہوتے رہے۔ آج کل انڈونیشیا' ملائیشیا' حجاز' مصر و شام اور مشرقی افریقہ کے مسلمانوں کی اکثریت فقہ شافعی کی پیرو ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ (789ء۔855ء)

اس دور کے چوتھے بڑے فقیہہ امام شافعی کے شاگرد امام حنبل ہیں۔ وہ اپنے زمانے میں حدیث کے سب سے بڑے عالم تھے۔ انہوں نے ''مسند'' کے نام سے احادیث کا بڑا مجموعہ مرتب کیا' جس میں تقریباً چالیس ہزار احادیث ہیں۔ خلیفہ معتصم نے ان پر بہت تشدد کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایک بات جس کو امام حنبل قرآن و حدیث کے خلاف سمجھتے تھے' ان سے منوائے' لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ اس پر خلیفہ نے ان کو کوڑوں سے اتنا پٹوایا کہ وہ بے ہوش ہو گئے۔ امام حنبل نے یہ تمام مظالم برداشت کئے' لیکن جھوٹ کے ساتھ مصالحت نہیں کی۔ ان کی قربانیوں کی وجہ سے ان کو تمام دنیائے اسلام میں ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ دلوں کے بادشاہ بن گئے۔ جب بغداد میں ان کا انتقال ہوا تو آٹھ لاکھ سے زیادہ لوگ جنازے میں شریک تھے۔ اتنے لوگوں نے کبھی بڑے سے بڑے بادشاہ کے جنازے میں بھی شرکت نہیں کی۔ عباسی خلافت کے دورِ زوال میں فقہ حنبلی نے پیروؤں کا بغداد میں بڑا زور تھا' لیکن اب صرف عرب کے صوبہ نجد میں ان کی اکثریت ہے۔ فقہ حنبلی کے پیرو علماء میں سب سے زیادہ شہرت امام ابن تیمیہ نے حاصل کی۔

فقہ جعفری کے بانی امام جعفر صادق (699ء۔765ء) ہیں جو عہد اموی کے عالم ہیں۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک دونوں امام جعفر صادق کے شاگرد ہیں۔ پاکستان' ہندوستان' ایران اور عراق کے شیعہ باشندے فقہ جعفری پر عمل کرتے ہیں۔

امام بخاریؒ (810ء۔870ء)

عباسی خلافت کے عہد کے محدثین میں محمد بن اسماعیل بہت ممتاز ہیں جو امام بخاری کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا مرتب کیا ہوا مجموعۂ احادیث ''صحیح بخاری'' ہے جسے مسلمان قرآن مجید کے بعد دنیا کی سب سے صحیح کتاب سمجھتے ہیں۔ یہ مجموعہ مرتب کرنے میں امام بخاری کی زندگی کے تیس سال صرف ہوئے۔

صحاح ستہ: احادیث کا ایک اور مجموعہ ''صحیح مسلم'' بھی اسی عہد کا عظیم کارنامہ ہے۔ یہ امام مسلم (817ء۔865ء) کی محنت و کاوش کا نتیجہ ہے اور یہ صحیح بخاری کے معیار کی چیز ہے۔ اسی زمانے کے ایک اور بڑے محدث امام ترمذی (824ء۔893ء) ہیں جو امام بخاری کے شاگرد تھے۔ ان کی تصنیف ''شمائل'' آج تک مشہور ہے۔ اس میں انہوں نے صحیح احادیث کی مدد سے آنحضرتؐ کی زندگی کے واقعات رقم کئے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ''صحیح ترمذی'' بھی مرتب کی جو احادیث نبویؐ کا مجموعہ ہے۔

صحیح بخاری' صحیح مسلم اور صحیح ترمذی کے علاوہ عہدِ عباسی میں احادیث کے تین اور معتبر و مستند مجموعے مرتب ہوئے جو اپنے مرتب کرنے والوں کے نام پر ابوداؤد (817ء۔888ء)' ابن ماجہ (824ء۔886ء) اور نسائی (835ء۔915ء) کہلاتے ہیں۔ صحیح حدیث کے یہ چھ مشہور مجموعے ''صحاح ستہ'' کہلاتے ہیں اور آج تک امت مسلمہ کی آنکھوں کا نور اور ان کی بنیادی دینی تعلیم و تدریس کے نصاب میں شامل ہیں۔

تاریخ و جغرافیہ

عہد عباسی میں تاریخ و سوانح کے موضوع پر بڑا کام ہوا۔ ابن ہشام (وفات 824ء) کی ''سیرت النبیؐ'' آنحضورؐ کے حالاتِ زندگی پر اولین سوانح شمار ہوتی ہے۔ سوانح نگار ابن سعد (وفات 845ء) کی تصنیف ''طبقات'' آج تک مقبول ہے' جس میں آنحضورؐ کے علاوہ ان کے صحابہؓ اور تابعین کے بھی حالات درج ہیں۔ مسلمانوں کی فتوحات پر ''فتوح البلدان'' بڑی مشہور کتاب ہے جو مورخ بلاذری (وفات 892ء) کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں حضرت عمرؓ کے زمانے تک کے حالات' فتوحات اور اندلس' وسط ایشیا اور سندھ وغیرہ کی فتوحات کا ذکر ہے۔

اس عہد کے سب سے بڑے مورخ طبری (839ء۔923ء) ہیں جن کی ''تاریخ طبری'' چودہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے' جس میں پیغمبرِ اسلامؐ کے زمانے سے اپنے زمانے تک تین سو برس کی تاریخ تفصیل سے لکھی ہے۔ طبری نے قرآن مجید کی ایک بہت بڑی تفسیر بھی لکھی ہے۔ طبری ان دو خاص کتابوں کے علاوہ کئی اور بڑی کتابوں کے بھی مصنف ہیں۔

اس عہد کے مصنفین میں مسعودی (وفات 965ء) کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ وہ مورخ ہونے کے علاوہ ایک بڑے جغرافیہ داں اور بہت بڑے سیاح بھی تھے۔ مسعودی بغداد کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے 917ء میں بغداد سے اپنا سفر شروع کیا' اور ایران' پاکستان' سندھ' ملتان' بھارت کے مغربی ساحل کے ساتھ ساتھ مالابار' سری لنکا چین' زنجبار اور مشرقی افریقہ کے ساحلوں کی سیر کرتے ہوئے مُدغاسکر تک پہنچے۔ یہاں سے جنوبی عرب اور عمان سے ہوتے ہوئے بغداد واپس آ گئے۔ سفر کے شوق نے پھر بے چین کیا۔ اب انہوں نے ایشیائے کوچک کا رخ کیا اور وہاں سے شام اور فلسطین کی سیر کرتے ہوئے مصر پہنچے۔ وہ ابھی اندلس جانے کا ارادہ رکھتے تھے' لیکن زندگی نے وفا نہ کی' ابھی مصر میں تھے کہ شہر فسطاط میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مسعودی بیس سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں' لیکن سوائے دو کتابوں کے اب ان کی اور کوئی کتاب نہیں ملتی۔ ان دو کتابوں کے نام ''مروج الذہب'' اور ''التنبیہ والاشراف'' ہیں۔

ابوالحسن اشعری

اس عہد کے علماء میں ابوالحسن اشعری (873ء۔935ء) کو بھی معتزلہ کے نقاد ہونے کی حیثیت سے بڑا مقام حاصل ہے۔ ایرانیوں اور دوسری غیر عرب قوموں کے مسلمان ہونے کے باوجود ان میں اسلام کی سچی روح نہیں سما سکی تھی۔ وہ اپنے سابقہ ہم مذہب' غیر مسلم باشندوں سے زیادہ میل جول رکھتے تھے۔ پھر یونانی فلسفہ' ہندومت اور دیگر غیر مسلم مصنفین کی کتابوں کے عربی زبان میں جو تراجم وسیع پیمانے پر پھیلائے گئے' ان کی وجہ سے بھی اس عہد کے مسلمانوں میں غیر اسلامی اور غیر شیعی خیالات پھیلنا شروع ہو گئے۔ مامون کا فتنۂ خلقِ قرآن ایک نیا عقلیت پرست گروہ معتزلہ وجود میں آیا جو وحی الٰہی کے بجائے عقل ہی کو منبع علم و عمل خیال کرتا تھا۔ امام حنبل اور امام شافعی وغیرہ نے معتزلہ کے خیالات کی روک تھام کی' لیکن ان گمراہ کن عقلیت پرستانہ خیالات کا' عقل ہی کی بنیاد پر جس نے کامیاب مقابلہ کیا' وہ امام ابوالحسن اشعری ہیں۔ انہوں نے پہلی مرتبہ دلائل و براہین سے' اور عقل کی بنیاد پر اسلامی عقائد و شریعت کی صداقت بیان کی اور ایک نئے علم کی بنیاد ڈالی جو ''علمِ کلام'' کہلاتا ہے اور جس کا مقصد وحی کی حقانیت کو عقلی دلائل سے ثابت کرنا ہے۔ امام اشعری تقریباً ڈھائی سو کتابوں کے مصنف ہیں جن میں ''الابانہ'' اور ''مقالات اسلامیین'' معرکے کی کتابیں ہیں۔

سائنسی علوم

عباسی عہد میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم مثلاً ریاضی' طب' طبیعیات' کیمیا' فلکیات' فلسفہ' منطق اور دوسرے سائنسی علوم نے بھی بہت ترقی کی' بلکہ اسے اسلامی سائنس کا دورِ اول قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ علوم مسلمانوں نے پہلی مرتبہ یونانی' سنسکرت اور دوسری زبانوں کے تراجم سے سیکھے' لیکن جلد ہی وہ ان علوم پر اس طرح حاوی ہو گئے جیسے یہ ان کے اپنے علوم ہوں۔ انہوں نے اس معاملے میں رسول کریمؐ کی حدیث پر عمل کیا: ''حکمت مسلمانوں کی

کھوئی ہوئی میراث ہے' اس لئے وہ جہاں سے بھی ملے' حاصل کرلو۔''

چنانچہ مسلمانوں نے سائنسی علوم میں ایسی بلند پایہ کتابیں تصنیف کیں جو آج بھی اپنے اپنے شعبے کی بنیادی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ عہد عباس کے خاص خاص سائنس دانوں اور ان کے کارناموں کا تعارف یہ ہے:

محمد بن موسیٰ خوارزمی (متوفی 844ء) اس عہد کے بڑے ریاضی داں تھے۔ انہوں نے ریاضی' الجبرا اور فلکیات پر معیاری کتابیں تصنیف کیں اور ان علوم میں نئے اضافے کئے۔ اہل یورپ نے ہندوسوں اور صفر کا استعمال خوارزمی ہی سے سیکھا۔

میکانیات یعنی مختلف آلات اور مشینیں بنانے کی ٹیکنالوجی کو تین بھائیوں نے بڑی ترقی دی جو بنوموسیٰ بن شاکر کہلاتے تھے' اور ان علوم پر لازوال کتابیں تصنیف کیں۔ خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں کرۂ ارض کی پیائش ان ہی بھائیوں نے کی تھی۔ مشہور کیمیا داں جابر بن حیان بھی اسی عہد کا کیمیا داں ہے۔ یورپ کے سائنس دانوں نے جابر کو جدید کیمیا کا بانی کہا ہے۔ علم کیمیا پر اس نے جو کتابیں لکھی ہیں وہ ایک ہزار صفحوں پر پھیلی ہوئی ہیں اور یورپ میں چھپ گئی ہیں۔ یورپ میں دورِ جدید سے پہلے جتنے بھی سائنس دان ہوئے ہیں' انہوں نے جابر کی تحقیقات سے فائدہ اٹھایا۔

طب میں سب سے زیادہ کمال زکریا رازی نے حاصل کیا۔ رازی نہ صرف اسلامی تاریخ میں سب سے بڑے طبیب مانے گئے ہیں' بلکہ دنیا بھر کے بڑے طبیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ انہوں نے علم طب پر جو کتابیں لکھیں' اُن کے تراجم یورپ کی کئی زبانوں میں ہوئے' آج مغرب میں طب کے عروج کا پہلا سبب رازی ہیں۔

فلسفے میں یعقوب' کندی اور فارابی نے شہرت حاصل کی۔ الکندی پہلا عرب فلسفی' خلیفہ مامون الرشید کے عہد سے تعلق رکھتا تھا۔ فارابی نے فلسفے کو ترقی دی اور ارسطو کے معلم ثانی کے لقب سے مشہور ہوا۔ ان تینوں فلاسفہ نے مغربی فلسفے کو متاثر کیا۔

ادب اور شاعری

ادبیات کے فروغ کے معاملے میں عہد عباسی کو بلند مقام حاصل ہے۔ افسانوی ادب میں ''الف لیلہ'' کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے اور اسے عالمی کلاسیکی ادب میں ممتاز درجہ حاصل ہے۔ یہ عجیب وغریب کتاب خلیفہ ہارون الرشید کے عہد کی ہے۔ لغت نویسی' گرائمر اور علم نحو نے باضابطہ شکل اسی عہد میں اختیار کی۔ علم نحو کے سب سے بڑے ماہر اور مصنف خلیل نحوی' سیبویہ اور اصمعی تھے۔ یہ

خلافتِ عباسیہ کی شہر بہ شہر' علمی زندگی

بغداد

درس گاہیں:

1- مدرسہ نظامیہ (1066ء)
2- مدرسہ مستنصریہ (1234ء)
3-30 عالی شان دارالعلوم' مختلف وقتوں میں قائم ہوئے۔
4- اعلیٰ تعلیم کے بیس مدرسے۔

اہم شخصیات:

1- بنوموسیٰ
2- امام احمد بن حنبل
3- طبری
4- مسعودی
5- ابن ندیم
6- ابن حوقل
7- عبدالقادر جیلانی
8- ابن جوزی

کتب خانے:

یونانی' سریانی' سنسکرت اور دوسری زبانوں سے تراجم (تقریباً 300)
بغداد میں کاغذ سازی کا پہلا کارخانہ (794ء)
کتب خانہ ''بیت الحکمت''..... (دس ہزار کتابیں)
رصد گاہیں: اسلامی دنیا کی پہلی دو رصد گاہیں (830ء)

کوفہ

درس گاہیں:

عربی حروف پر اعراب اور نقطے لگائے گئے۔ نیا رسم الخط ایجاد ہوا۔

اہم شخصیات:

1- امام ابوحنیفہ۔
2- جابر بن حیان۔
3- یعقوب کندی۔
4- متنبی۔

بصرہ

کتب خانے:

ابن سوار کا بڑا کتب خانہ۔

اہم شخصیات:

1- ابن سعد
2- ابوداؤد
3- اشعری۔
4- ابن ہیثم

مدینہ

اہم شخصیات:

امام مالک

تینوں لغت اور نحو کے امام اور بانی ہیں۔

ادب میں سب سے بڑی شخصیت جاحظ کی ہیں۔ سادہ طرزِ تحریر' خیالات کی گہرائی' شاعرانہ رنگینی' طنز و ظرافت' جاحظ کی تحریر کی خصوصیات ہیں۔ وہ عقائد کے لحاظ سے معتزلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے ملوکیت کے نظام پر سخت حملے کئے۔ ان کی تصانیف میں سے ''کتاب الحیوان'' اور ''کتاب البیان'' نے شہرت جاوید حاصل کی۔

''کتاب الحیوان'' کا شمار اُن چار بڑی کتابوں میں ہوتا ہے جن پر عربی ادب کا دارومدار ہے۔ عربی ادب کے ان چار شاہکاروں میں سے باقی تین بھی عہدِ عباسی میں لکھے گئے یعنی ابن قتیبہ کی ''ادب الکاتب'' اور ''عیون الاخبار'' اور امام مبرد کی کتاب ''الکامل فی الادب''۔ ابن قتیبہ کی ''عیون الاخبار'' دس جلدوں پر مشتمل ہے۔ مبرد کی ''الکامل فی الادب'' اُس زمانے کے سماجی حالات اور معاشرتی زندگی کے بارے میں معلومات کا بہت عمدہ ماخذ ہے۔

عربی شاعری بھی اپنے عروج پر اسی دور میں پہنچی۔ اُموی دور کے تین شاعر اطلل' جریر اور فرزدق عربی زبان کے صفِ اول کے شاعر سمجھے جاتے تھے' لیکن عہدِ عباسی کے شعرا ان سب سے آگے بڑھ گئے۔ اِن شعراء میں ابوتمام' ابوالعتاہیہ' ابونواس اور بحتری سب سے نمایاں ہیں۔ یہ شعراء تو قصیدہ گو تھے یعنی خلفاء اور امراء کی تعریف میں نظمیں کہتے تھے یا انہوں نے اس دور کی مادّی اور عیش پرستانہ زندگی کی ترجمانی کی۔ ان میں ابوالعتاہیہ دوسروں سے مختلف تھا' کیونکہ اس کا موضوع دنیا کی بے ثباتی اور انسان کا اخلاق تھا۔

خودمختار حکومتیں

جیسا کہ کسی بھی سلطنت یا حکومت کے زوال کے عہد میں ہوا کرتا ہے' خلافتِ عباسیہ کے دورِ زوال میں بھی خودمختار اور آزاد چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ خلافتِ عباسیہ کے عروج میں تمام دنیائے اسلام پاکستان سے لے کر فرغانہ اور قیروان تک عباسی خلافت کے ماتحت تھی۔ گویا اُس وقت اُمتِ مسلمہ سیاسی لحاظ سے بڑی حد تک متحد تھی' لیکن عباسی خلافت کے زوال کے ساتھ ہی اس وحدت و اتحاد میں شگاف پڑنے شروع ہوئے۔ جس صوبہ دار کو جہاں موقع ملا' اُس نے خودمختار حکومت قائم کر لی۔ اس طرح ایک مرکزی حکومت کے ماتحت بجائے فرماں بردار صوبائی حکومتوں کے' نو دس خودمختار حکومتیں قائم ہوگئیں' جن کے نام یہ ہیں:

(۱) صفاری (867ء۔ 910ء): اس حکومت کا بانی یعقوب بن لیث صفار تھا۔ پورا جنوبی ایرانی صفاریوں کے قبضے میں تھا۔ (اس حکومت کا خاتمہ سامانیوں نے کیا' جن کا ذکر آگے آ رہا ہے)۔

(2) علویہ (868ء۔ 928ء): اس کے بانی حسن بن زید علوی تھے اور یہ ایران کے شمالی حصے مازندران میں قائم ہوئی تھی جس کو اُس زمانے میں طبرستان کہتے تھے۔ (اس حکومت کا بھی خاتمہ سامانیوں نے کیا)

(3) طولونیہ (868ء۔ 904ء): اس حکومت کا بانی ایک ترک احمد بن طولون تھا۔ مصر اور شام اُس کی حکومت کے قبضے میں تھے۔ یہ حکومت مضبوط اور رعایا پرور تھی۔ قاہرہ کی مشہور مسجد طولون اُسی دور کی یادگار ہے۔

(4) آلِ حمدان (905ء۔ 1015ء): یہ عربوں کی حکومت تھی۔ پہلے اس کا مرکز موصل (عراق) تھا۔ پھر حلب (شام) ہوگیا۔ حمدانی حکمرانوں میں سیف الدولہ قابلِ ذکر ہے۔ مسلمانوں میں باہمی خانہ جنگی ہو جانے کی وجہ سے رومی زور پکڑ گئے تھے۔ سیف الدولہ کی حکومت اگرچہ چھوٹی سی تھی' لیکن اُس نے رومیوں کی پیش قدمی روک دی۔ اس کے علاوہ سیف الدولہ علم و ادب کا بڑا سرپرست تھا۔ عربی کا سب سے بڑا شاعر متنبی اور مشہور فلسفی فارابی اُس کے دربار سے وابستہ تھے۔

(5) زیاریہ (931ء۔ 1038ء): یہ آلِ وشمگیر کی ایرانی حکومت تھی اور ایران کے شمال مشرقی صوبے جرجان یا گرگان میں قائم ہوئی۔

(6) اخشیدیہ (935ء۔ 968ء): یہ ترکوں کی حکومت تھی۔ طولونی حکومت کے خاتمے کے بعد مصر اور شام پھر عباسی خلفاء کے زیرِ اقتدار آ گئے تھے' لیکن چند برس کے بعد یہ علاقے پھر اُن کے ہاتھ سے نکل گئے اور یہاں اخشیدی حکومت قائم ہوگئی جس کا خاتمہ شمالی افریقہ کی فاطمی حکومت نے کیا۔ اخشیدیوں کا وزیر ایک حبشی ملک کافور تھا جو بڑا قابل اور علم دوست تھا۔

یہ حکومتیں خودمختار تو تھیں' لیکن مضبوط نہ تھیں۔ پچاس ساٹھ سال سے زیادہ ان میں سے کوئی حکومت بھی نہ چل سکی۔ البتہ تین خودمختار حکومتیں ایسی تھیں جو بڑی مضبوط اور پائیدار تھیں یعنی سامانی' بنی بویہ اور بنی فاطمہ۔ ان کے حالات عہدِ عباسی کے حوالے سے کسی قدر تفصیل چاہتے ہیں:

(1) سامانی حکومت (874ء۔ 1004ء)

یہ حکومت 874ء (261 ہجری) میں ماوراء النہر میں قائم ہوئی۔ یہ خاندان اپنے مورثِ اعلیٰ اسد بن سامان کے نام پر سامانی کہلاتا ہے۔ موجودہ افغانستان بھی اس حکومت میں شامل تھے۔ اس کا دارالحکومت بخارا تھا۔ سامانیوں نے کل 134 سال حکومت کی۔ اس عرصے میں اُن کے دس حکمران ہوئے ان میں سب سے مشہور اور اچھا حکمران اسماعیل سامانی تھا۔ وہ بڑا نیک اور عادل بادشاہ تھا۔ نصر دوم کا عہد علم و ادب کی سرپرستی کی وجہ سے ممتاز ہے۔ اُس کے بیٹے نوح اوّل کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اُس نے بخارا میں ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا تھا۔

سامانی دور میں ترکوں میں اسلام تیزی سے پھیلا اور چوتھی صدی کے آخر تک مشرقی ترکستان یعنی کاشغر اور اُس کے ملحق علاقے میں اور شمالی ترکستان سے لے کر رُوس میں والگا کی وادی میں اسلام پھیل گیا۔

سامانی عہد میں علم و ادب کی دل کھول کر سرپرستی کی گئی۔ اب تک مسلمان جس قدر کتابیں لکھتے تھے' وہ عربی زبان میں ہوتی تھیں۔ سامانیوں نے اب فارسی کی سرپرستی شروع کر دی' کیونکہ وہ خود فارسی بولتے تھے۔ چنانچہ فارسی کا پہلا بڑا شاعر رودکی' اسماعیل کے پوتے نصر کے دربار کا شاعر تھا۔ اسی زمانے میں طبری کی مشہور تاریخ اور تفسیر کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ فلسفی فارابی اور ابن سینا کا تعلق بھی سامانی دربار سے رہا۔ علم الکلام کے ماہر امام منصور ماتریدی اور صوفیہ میں ابونصر سراج بھی سامانی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

اِس عہد کے سیاحوں میں تین نام بہت نمایاں ہیں۔ ایک اصطخری' دوسرا مقدسی اور تیسرا ابن حوقل۔ ان میں سے ابن حوقل بغداد سے روانہ ہوا اور تیس سال تک اسلامی دنیا کا سفر کرتا رہا۔ اُس نے سندھ اور ملتان کے حالات تفصیل سے لکھے ہیں۔

سمرقند' بخارا' خوارزم' بلخ' مرو' ہرات' نیشاپور اور رے سامانی مملکت کے بڑے اور خوشحال شہر تھے۔ ان سب شہروں کے حالات مقدسی نے اپنے سفرناموں میں بیان کئے ہیں۔

سامانی حکومت بھی بالآخر عباسیوں کی طرح کمزور ہوتی گئی۔ صوبیدار باغی ہونے لگے اور خراسان اور غزنی کے علاقوں میں اُن کے ایک سپہ سالار سبکتگین نے اپنی آزاد حکومت قائم کر لی۔ بخارا اور سمرقند پر کاشغر کے بادشاہ ایلک خان نے قبضہ کر کے سامانی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ (عمر خیام کا تعلق بھی ایلک خانی حکومت سے رہا ہے)

(2) بنی بویہ (945ء۔ 1055ء)

سامانیوں کی طرح دوسری بڑی حکومت' جو خلافتِ عباسیہ کے تحت' خودمختار اور آزاد تھی' وہ بنی بویہ کی تھی۔ اس خاندان کا تعلق مازندران کے علاقے دیلمی سے تھا' اس لئے بنی بویہ کو دیالمہ بھی کہا جاتا ہے۔

سامانیوں کی طرح یہ بھی ایک ایرانی خاندان تھا۔ اس حکومت کے بانی تین بھائی علی' حسن اور احمد تھے۔ انہوں نے بالترتیب عماد الدولہ' رُکن الدولہ اور مُعز الدولہ کے لقب

اختیار کئے اور ایران اور عراق میں علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم کیں۔ عمادالدولہ ان کا سربراہ تھا۔ اس کے بعد یہی حیثیت رُکن الدولہ اور اس کے بعد معزالدولہ اور اُس کی اولاد کو۔ بغداد پر معزالدولہ نے 945ء میں قبضہ کیا تھا۔ عراق اور خراسان کے علاوہ ایران بھی بنی بویہ کے قبضے میں تھا۔ بغداد' اصفہان اور شیراز اس سلطنت کے بڑے شہر تھے۔ سامانیوں کے زوال کے بعد رے پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔

بنی بویہ کا سب سے مشہور اور کامیاب حکمران عضدالدولہ تھا۔ اُس نے بغداد کو بڑی ترقی دی۔ نہریں کھدوائیں۔ دجلہ پر پُل بنایا۔ شیراز میں آبپاشی کے لئے اُس نے بہت بڑا بند تعمیر کیا جو "بندامیر" کے نام سے اب تک موجود ہے۔ اس کا ایک بڑا کارنامہ بغداد میں ایک عظیم الشان شفاخانہ قائم کیا جو 981ء تا 1258ء یعنی سقوطِ بغداد تک ڈھائی سو سال سے زیادہ عرصے تک قائم رہا۔ یہ شفاخانہ دریائے دجلہ کے کنارے ایک عالیشان عمارت میں تھا۔ یہ اتنا بڑا تھا کہ ساری دنیا میں کوئی شفاخانہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں 24 اطبا مقرر تھے۔ جراح یعنی سرجن' آنکھوں کا علاج کرنے والے اطبا اور مرہم پٹی کرنے والے اس کے علاوہ تھے۔ ساڑھے سات لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر اس شفاخانے کے لئے "وقف" تھی۔

عضدالدولہ کے بعد بنی بویہ کی حکومت میں بھی زوال و انتشار پیدا ہو گیا۔ عراق' رے اور ایران میں بویہی شہزادوں نے علیحدہ علیحدہ ریاستیں قائم کر لیں۔ ان میں "رے" کی حکومت اس لحاظ سے مشہور تھی کہ اس کے حکمران فخرالدولہ کو ایک بڑا قابل وزیر صاحب ابن عباد مل گیا تھا۔ اس نے بارہ سال وزارت کی اور ایسی شہرت حاصل کی جیسی عباسی خلافت کے زمانے میں برامکہ نے حاصل کی تھی۔ وہ صاحب تصنیف بھی تھا۔ اُس کا کتب خانہ اتنا بڑا تھا کہ ایک مرتبہ ایک سامانی بادشاہ نے اُس کو وزیر بنانے کی خواہش کی تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میرے کتب خانے کو منتقل کرنے کے لئے چار سو اونٹوں کی ضرورت ہو گی۔

غزنی کے حکمران محمود غزنوی نے 1029ء میں رے کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد 1055ء میں ترک سلجوقیوں نے بغداد پر قبضہ کر کے بنی بویہ کی حکومت کا ہر جگہ سے خاتمہ کر دیا۔ بنی بویہ عقیدے کے لحاظ سے شیعہ تھے اور محرم میں تعزیہ نکالنے اور عاشورہ کی رسوم' ماتم' سینہ کوبی' خنجر زنی وغیرہ ادا کرنے کا آغاز بنی بویہ ہی سے ہوا۔ بنی بویہ نے عباسی خلفاء کو بے دست و پا کر دیا اور انہیں مختلف طریقوں سے تنگ اور رسوا کیا۔

بنی بویہ کے کئی حکمران اور وزراء علم و ادب کے بڑے سرپرست تھے۔ عضدالدولہ اور صاحب ابن عباد خاص طور پر مشہور ہیں۔ عربی زبان کا سب سے بڑا شاعر متنبی (915ء۔965ء) اسی عہد میں ہوا ہے۔ اس نے عضدالدولہ اور صاحب ابن عباد کی تعریف میں قصیدے لکھے اور انعامات پائے۔

بو علی سینا اور ابن الہیثم کا تعلق اسی حکومت سے تھا۔ فلسفے کی مشہور کتاب رسائل "اخوان الصفا" بھی اسی زمانے میں لکھی گئی۔

بنی بویہ کے ان کارناموں کے باوجود اُن کا دورِ حکومت مسلمانوں میں عقائد کی کمزوری اور اخلاق کی خرابی کا باعث ہوا۔ چنانچہ جب ہم اس دَور کی سیاحوں کی کتابیں پڑھتے ہیں تو اس وقت کے عراق کے بارے میں خاصی روشنی پڑتی ہے۔ سیاح اور جغرافیہ نویس مقدسی لکھتا ہے:

"عراق کے مفاخر اتنے ہیں کہ اِن کا شمار نہیں کیا جا سکتا' لیکن آج کل یہ فتنہ سازی اور گرانی کا گھر بنا ہوا ہے۔ روز بروز حالت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ ظلم اور بھاری ٹیکسوں کی وجہ سے لوگ مصیبت میں ہیں اور بے حیائیاں زیادہ ہیں...... بغداد اُجڑ چکا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ سامرا کی طرح برباد ہو جائے گا۔ فتنے' فساد' جہالت اور فسق و فجور کا بازار گرم ہے اور حکومت جابر و ظالم ہے...... کوفہ ایک زمانے میں بغداد کا ہم پلہ تھا' لیکن اس وقت حالت خراب ہے اور بیرونی حصے اُجڑے ہوئے ہیں ...... بصرہ بغداد کی نسبت زیادہ اچھا شہر ہے' کیونکہ یہاں معاشی آسانیاں زیادہ ہیں اور علوم و فنون بھی ترقی پر ہیں"۔

(3) سلطنتِ فاطمیہ (909ء۔1171ء)

اب تک جو خود مختار حکومتیں قائم ہوئی تھیں' وہ سب بغداد کی خلافت کو تسلیم کرتی تھیں اور جمعہ کی نماز کے خطبے میں عباسی خلیفہ کا نام لیا جاتا تھا' لیکن فاطمی حکمرانوں نے عباسی خلفاء کا نام خطبے سے نکال دیا اور خود خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس لئے اُن کی حکومت کو "خلافتِ فاطمیہ" بھی کہا جاتا ہے۔

یہ حکومت شمالی افریقہ کے شہر قیروان میں قائم ہوئی۔ اس کا بانی عبیداللہ چونکہ آنحضرت ﷺ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں سے تھا' اس لئے اُسے سلطنتِ فاطمیہ کہا جاتا ہے۔ عبیداللہ تاریخ میں مہدی کے لقب سے مشہور ہے۔

عبیداللہ مہدی اور اُن کے پیرو شیعہ فرقے کی ایک شاخ ہے۔ یہ لوگ امام جعفر صادق تک تو تمام اماموں کو مانتے ہیں' لیکن اس کے بعد امام جعفر صادق کے بڑے صاحبزادے اسماعیل کو مانتے ہیں' جبکہ اثنا عشری عقیدے کے مطابق امامت کا سلسلہ امام جعفر صادق کے دوسرے صاحبزادے امام موسیٰ کاظم کی نسل میں چلتا ہے۔ فاطمی خلفاء چونکہ اسماعیل کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے تھے' اس لئے وہ اسماعیلی کہلائے۔ آغا خانی خوجے اسی اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

شروع شروع میں فاطمی حکومت شمالی افریقہ تک محدود رہی' لیکن اُن کے ایک حکمران المعز نے 968ء میں مصر بھی فتح کر لیا۔ وہ فاطمی حکومت کا سب سے قابل حکمران تھا۔ وہ افریقہ سے مصر آ گیا۔ مصر کے موجودہ شہر قاہرہ کی بنیاد اُسی کے عہد میں پڑی۔ یہ شہر فسطاط کے قریب آباد کیا گیا تھا اور فاطمیوں کا دارالحکومت تھا۔ معز کے عہد میں جامع ازہر کے نام سے قاہرہ میں ایک مسجد تعمیر کی گئی' جہاں عزیز باللہ کے عہد میں 975ء میں ایک تعلیمی و دینی درس گاہ قائم کی گئی جو آج تک موجود ہے اور دنیا کے ہر حصے سے مسلمان طلبہ وہاں دینی تعلیم کے لئے جاتے ہیں۔

المعز کے بعد اُس کا لڑکا عزیز باللہ (975ء تا 996ء) تخت پر بیٹھا۔ وہ بھی ایک قابل حکمران تھا۔ اُس کے زمانے میں شام' حجاز' یمن پر بھی فاطمیوں کا قبضہ ہو گیا اور اس طرح فاطمی حکومت اسلامی دنیا کی سب سے بڑی سلطنت بن گئی۔ فاطمیوں کے زمانے میں مسلمانوں کی بحری طاقت نے بڑی ترقی پائی۔ صقلیہ اور اٹلی کا جنوبی حصہ اُن کے قبضے میں تھا۔ فاطمی بیڑے جینوا' روم اور نیپلز پر حملے کرتے رہتے تھے اور یورپ کے بحری بیڑے اُن کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتے تھے۔

عباسی خلافت کے زوال کے دوران جو خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں اُن میں فاطمی سلطنت نہ صرف سب سے بڑی اور طاقتور تھی' بلکہ سب سے زیادہ پائیدار بھی تھی۔ یہ حکومت تقریباً پونے تین سو سال قائم رہی۔ 1171ء میں شام کے حکمران نورالدین زنگی نے اس حکومت کا خاتمہ کر دیا' جس کے بعد مصر میں جمعے کے خطبوں میں بغداد کے عباسی خلیفہ کا نام لیا جانے لگا۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں' نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا؟
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!
ولایت' پادشاہی' علمِ اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اِک نکتۂ ایماں کی تفسیریں!
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!
یقیں محکم' عمل پیہم' محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

خلافت عباسیہ اور سلجوقی ترک

خلافتِ عباسیہ کا عہدِ زوال تقریباً دو سو سال تک پھیلا ہوا ہے۔ ان دو صدیوں کے دوران میں خلافت' جیسا کہ اوپر بیان ہوا' چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتوں میں تقسیم رہی۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ سلجوقی ترکوں نے اسلامی دنیا کو ایک بار پھر متحد کر دیا۔ سلجوق نسلاً ترک تھے اور اسلام قبول کرنے کے بعد وسط ایشیا کے میدانوں سے نکل کر خراسان میں آباد ہو گئے تھے۔ اس وقت خراسان پر غزنوی سلطنت قائم تھی۔

سلجوقی سردار طغرل نے غزنوی حکمران مسعود کو شکست دے کر خراسان میں سلجوقی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ خراسان میں حکومت مضبوط ہو جانے کے بعد طغرل نے مغرب کا رخ کیا اور ایران فتح کرتا ہوا 1055ء میں بغداد میں داخل ہوا جو اس وقت بنی بویہ کے قبضے میں تھا۔

طغرل کے بعد اس کا بھتیجا الپ ارسلان (1063ء تا 1072ء) تخت نشین ہوا۔ الپ ارسلان نے آرمینیا' ایشیائے کوچک' شام اور ماوراءالنہر کو فتح کر کے سلجوقی سلطنت کو وسیع کر دیا۔ اس کے اقتدار کا یہ عالم تھا کہ اس کے نام کا خطبہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بھی پڑھا جانے لگا جو اس سے پہلے فاطمیوں کے قبضے میں تھے۔

الپ ارسلان نے ایشیائے کوچک کے شہر ملاز کرد کے پاس رومی شہنشاہ ارمانوس کو زبردست شکست دی۔ ارمانوس کے پاس دو لاکھ فوج تھی' جبکہ الپ ارسلان کے پاس صرف پندرہ ہزار فوج تھی۔ جمعہ کا دن تھا۔ سلطان نے پہلے جمعہ کی نماز پڑھی اور اللہ سے فتح کی دعا مانگی۔ اس کے بعد رومیوں کو شکست ہوئی اور ارمانوس گرفتار ہوا۔ ملاز کرد کی جنگ تاریخ کی فیصلہ کن لڑائیوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں پورا ایشیائے کوچک مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا اور یہ خطہ بتدریج ترکوں کا وطن بن گیا۔

الپ ارسلان کے بعد اس کا بیٹا ملک شاہ (1072ء تا 1092ء) اٹھارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں سلجوقی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ مغرب میں شام' جنوب میں یمن اور عمان فتح ہوئے۔ مشرق میں چین تک سلطنت کی حدود پھیل گئیں۔ ملک شاہ نے اپنی سلطنت کا سارا انتظام اپنے وزیر نظام الملک کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ وزیر اپنی خوبیوں میں ہارون الرشید کے برامکہ پر بھی بازی لے گیا۔ نظام الملک کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تعلیم کے فروغ پر خصوصی توجہ دی۔ اس نے سلطنت کے ہر حصے میں بڑے بڑے مدرسے قائم کئے' جو اس کے نام پر ''نظامیہ'' کہلاتے تھے۔ ان مدرسوں میں سب سے بڑا بغداد کا مدرسہ نظامیہ تھا۔ اس مدرسے کے اخراجات کے لئے بہت بڑی جائیداد وقف تھی۔ ہر طالب علم کو وظیفہ دیا جاتا تھا۔ ملک شاہ نے جب دیکھا کہ اس کا وزیر مدرسوں پر بے شمار دولت صرف کر رہا ہے تو ایک دن اس نے کہا: ''بابا! آپ مدرسوں پر جو روپیہ خرچ کر رہے ہیں' اگر وہ فوج پر خرچ کیا جائے تو دنیا فتح ہو سکتی ہے۔'' نظام الملک نے جواب دیا: ''بیٹے! تم جو فوج بھرتی کرو گے' اس کے تیر چند گز سے زیادہ دور نہ جا سکیں گے' لیکن میں اہل علم کی جو فوج تیار کر رہا ہوں' اس کے تیر افلاک کے بھی پار چلے جائیں گے۔''

نظام الملک کو ملک شاہ کے انتقال سے چند ماہ قبل ایک شخص نے جو حسن بن صباح کے باطنی فرقے سے تعلق رکھتا تھا' قتل کر دیا۔ نظام الملک نے ''سیاست نامہ'' اور ''دستور الوزراء'' کے نام سے دو کتابیں لکھی تھیں۔ یہ کتابیں جو فارسی میں ہیں' نظام الملک کے سیاسی تدبر کا شاہکار ہیں اور مسلمانوں کے سیاسی نظریات و افکار کا عمدہ نمونہ۔

ملک شاہ کے انتقال کے بعد اس کے بیٹوں محمود اور برکیارق میں خانہ جنگی ہو گئی۔ اس آپس کی لڑائی سے سلجوقی سلطنت کمزور ہو گئی اور شام' حجاز اور ایشیائے کوچک یا تو سلجوقیوں کے قبضے سے نکل گئے یا مرکزی حکومت کے تسلط سے آزاد ہو گئے۔ سلجوقیوں کی یہ باہمی لڑائی دنیائے اسلام کے لئے بڑی نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اس کی وجہ سے ایک طرف ترکستان اور خراسان کا علاقہ ترکوں کے ایک اور قبیلے ''غز'' نے تاخت و تاراج کر دیا۔ دوسری طرف فلسطین' اردن اور مغربی عراق پر یورپ کی مسیحی اقوام قابض ہو گئیں' اور تیسری طرف خود اندرون ملک بانیوں نے زور پکڑا۔ بالآخر تیرہ سال کی مسلسل خانہ جنگی کے بعد ملک شاہ کے ایک بیٹے محمد (1104ء تا 1117ء) نے سلجوقی سلطنت کے بڑے حصے میں پھر ایک مستحکم حکومت قائم کر دی۔ عراق' آرمینیا' ایران' ترکستان اور افغانستان کا مغربی علاقہ اب بھی اس سلطنت میں موجود تھا۔

سلجوقی ترکوں کا آخری طاقتور حکمران محمد کا بھائی سنجر (1117ء تا 1157ء) تھا۔ اس نے چالیس سال سے زیادہ حکومت کی۔ ترکستان اور خراسان کا علاقہ اس کی براہ راست حکومت میں تھا اور باقی مملکت یعنی ایران اور عراق میں اس کے بھائی اور ان کی اولاد سنجر کی طرف سے حکومت کرتے تھے۔

نیک طینت' عادل اور رعایا پرور سنجر اپنی وسیع سلطنت پر آرام سے حکومت کر رہا تھا کہ 1140ء میں شمال مشرق کی طرف سے ایک غیر مسلم قوم نے جو ''قرہ خطائی'' کہلاتی تھی' نے حملہ کر دیا۔ سنجر نے سمرقند کے قریب مقابلہ کیا' لیکن شکست کھائی' اور ماوراءالنہر کا سارا علاقہ سنجر کے قریب سے نکل گیا۔ سنجر اب بھی باقی سلطنت کو سنبھالے رہا' لیکن بارہ سال بعد تک ایک نومسلم ترک قبیلہ غز باغی ہو گیا۔ سنجر نے 1158ء میں ان کے مقابلے میں شکست کھائی اور غزوں کے ہاتھوں قید ہو گیا۔

غزوں نے اپنی اس کامیابی کے بعد سارے علاقے میں تباہی مچا دی۔ لوگوں کا قتل عام کیا۔ مسجدیں اور مدرسے ڈھا دیئے' شہر اور بستیاں اجاڑ دیں۔ چنگیز خان کے حملے سے قبل خراسان پر ایسی تباہی کبھی نہیں آئی تھی۔ فارسی کے شاعر انوری نے خراسان کی اس تباہی کا بڑا دردناک نقشہ کھینچا ہے۔

چار سال کے بعد سلجوقیوں کا زوال شروع ہو گیا۔ ماوراءالنہر پہلے ہی ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اب خراسان اور عراق بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ہاں' ان کا ایک خاندان کرمان میں 1187ء تک' دوسرا خاندان کردستان میں 1194ء تک اور تیسرا خاندان ایشیائے کوچک میں 1300ء تک حکومت کرتا رہا۔

ان چھوٹی چھوٹی سلجوقی حکومتوں میں ایشیائے کوچک کی حکومت جو ''سلاجقۂ روم'' کی حکومت کے نام سے مشہور ہے' سب سے بڑی' مضبوط اور پائیدار تھی۔ تاریخ اسلام میں سلاجقۂ روم کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس زمانے میں یورپ کی قوموں نے مل کر بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لئے جو صلیبی جنگیں شروع کیں' ان کا پہلا نشانہ روم کے یہی سلجوقی مسلمان بنے۔ (صلیبی جنگیں آگے آ رہی ہیں)

سلجوقیوں کے عہد میں بڑے بڑے ترقیاتی کام ہوئے۔ کردستان اور کرمان کے صوبوں کو' جو بہت پسماندہ علاقے تھے' خاص طور پر بڑی ترقی دی گئی۔ اس دور میں دریائے سیحوں سے دریائے فرات تک کے وسیع علاقے میں' جس میں ترکستان' عراق اور ایران کے ملک شامل ہیں' سو سال تک مکمل امن و امان رہا۔ امن و امان کے بعد دوسرا بڑا کارنامہ تعلیم عامہ پر خصوصی توجہ اور مدرسوں کا قیام ہے۔ پہلے تعلیم کا انتظام مسجدوں کے اندر ہوتا تھا' لیکن سلجوقی دور میں لائق وزیر اعظم نظام الملک نے مدرسوں کے لئے

اختیار کئے اور ایران اور عراق میں علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم کیں۔ عماد الدولہ ان کا سربراہ تھا۔ اس کے بعد یہی حیثیت رُکن الدولہ اور اس کے بعد معز الدولہ اور اُس کی اولاد کو۔ بغداد پر معز الدولہ نے 945ء میں قبضہ کیا تھا۔ عراق اور خراسان کے علاوہ ایران بھی بنی بویہ کے قبضے میں تھا۔ بغداد' اصفہان اور شیراز اس سلطنت کے بڑے شہر تھے۔ سامانیوں کے زوال کے بعد رے پر بھی ان کا قبضہ ہو گیا۔

بنی بویہ کا سب سے مشہور اور کامیاب حکمران عضد الدولہ تھا۔ اُس نے بغداد کو بڑی ترقی دی۔ نہریں کھدوائیں۔ دجلہ پر پُل بنایا۔ شیراز میں آبپاشی کے لئے اُس نے بہت بڑا بند تعمیر کیا جو "بند امیر" کے نام سے اب تک موجود ہے۔ اس کا ایک بڑا کارنامہ بغداد میں ایک عظیم الشان شفاخانہ قائم کیا جو 981ء تا 1258ء یعنی سقوطِ بغداد تک' ڈھائی سو سال سے زیادہ عرصے تک قائم رہا۔ یہ شفا خانہ دریائے دجلہ کے کنارے ایک عالیشان عمارت میں تھا۔ یہ اتنا بڑا تھا کہ ساری دنیا میں کوئی شفاخانہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں 24 اطبا مقرر تھے۔ جراح یعنی سرجن' آنکھوں کا علاج کرنے والے اطبا اور مرہم پٹی کرنے والے اس کے علاوہ تھے۔ ساڑھے سات لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر اس شفاخانے کے لئے "وقف" تھی۔

عضد الدولہ کے بعد بنی بویہ کی حکومت میں بھی زوال و انتشار پیدا ہو گیا۔ عراق' رے اور ایران میں بویہی شہزادوں نے علیحدہ علیحدہ ریاستیں قائم کر لیں۔ ان میں "رے" کی حکومت اس لحاظ سے مشہور تھی کہ اس کے حکمران فخر الدولہ کو ایک بڑا قابل وزیر صاحب ابن عباد مل گیا تھا۔ اس نے بارہ سال وزارت کی اور ایسی شہرت حاصل کی جیسی عباسی خلافت کے زمانے میں برامکہ نے حاصل کی تھی۔ وہ صاحبِ تصنیف بھی تھا۔ اُس کا کتب خانہ اتنا بڑا تھا کہ ایک مرتبہ ایک سامانی بادشاہ نے اُس کو وزیر بنانے کی خواہش کی تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میرے کتب خانے کو منتقل کرنے کے لئے چار سو اونٹوں کی ضرورت ہو گی۔

غزنی کے حکمران محمود غزنوی نے 1029ء میں رے کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد 1055ء میں ترک سلجوقیوں نے بغداد پر قبضہ کر کے بنی بویہ کی حکومت کا ہر جگہ سے خاتمہ کر دیا۔ بنی بویہ عقیدے کے لحاظ سے شیعہ تھے اور محرم میں تعزیہ نکالنے اور عاشورہ کی رسوم' ماتم' سینہ کوبی' نوحہ زنی وغیرہ ادا کرنے کا آغاز بنی بویہ ہی سے ہوا۔ بنی بویہ نے عباسی خلفاء کو بے دست و پا کر دیا اور انہیں مختلف طریقوں سے تنگ اور رسوا کیا۔

بنی بویہ کے کئی حکمران اور وزراء علم و ادب کے بڑے سرپرست تھے۔ عضد الدولہ اور صاحب ابن عباد خاص طور پر مشہور ہیں۔ عربی زبان کا سب سے بڑا شاعر متنبی (915ء۔ 965ء) اسی عہد میں ہوا ہے۔ اس نے عضد الدولہ اور صاحب ابن عباد کی تعریف میں قصیدے لکھے اور انعامات پائے۔

بوعلی سینا اور ابن الہیثم کا تعلق اسی حکومت سے تھا۔ فلسفے کی مشہور کتاب رسائل "اخون الصفا" بھی اسی زمانے میں لکھی گئی۔

بنی بویہ کے ان کارناموں کے باوجود اُن کا دورِ حکومت مسلمانوں میں عقائد کی کمزوری اور اخلاق کی خرابی کا باعث ہوا۔ چنانچہ جب ہم اس دور کی سیاحوں کی کتابیں پڑھتے ہیں تو اس وقت کے عراق کے بارے میں خاصی روشنی پڑتی ہے۔ سیاح اور جغرافیہ نویس مقدسی لکھتا ہے:

"عراق کے مفاخر اتنے ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا' لیکن آج کل یہ فتنہ سازی اور گرانی کا گھر بنا ہوا ہے۔ روز بروز حالت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ ظلم اور بھاری ٹیکسوں کی وجہ سے لوگ مصیبت میں ہیں اور بے حیائیاں زیادہ ہیں..... بغداد اُجڑ چکا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ سامرا کی طرح برباد ہو جائے گا۔ فتنے' فساد' جہالت اور فسق و فجور کا بازار گرم ہے اور حکومت جابر و ظالم ہے..... کوفہ ایک زمانے میں بغداد کا ہم پلہ تھا' لیکن اس وقت حالت خراب ہے اور بیرونی حصے اُجڑے ہوئے ہیں..... بصرہ بغداد کی نسبت زیادہ اچھا شہر ہے' کیونکہ یہاں معاشی آسانیاں زیادہ ہیں اور علوم و فنون بھی ترقی پر ہیں"۔

(3) سلطنتِ فاطمیہ (909ء۔1171ء)

اب تک جو خودمختار حکومتیں قائم ہوئی تھیں' وہ سب بغداد کی خلافت کو تسلیم کرتی تھیں اور جمعہ کی نماز کے خطبے میں عباسی خلیفہ کا نام لیا جاتا تھا' لیکن فاطمی حکمرانوں نے عباسی خلفاء کا نام خطبے سے نکال دیا اور خود خلیفہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس لئے اُن کی حکومت کو "خلافتِ فاطمیہ" بھی کہا جاتا ہے۔

یہ حکومت شمالی افریقہ کے شہر قیروان میں قائم ہوئی۔ اس کا بانی عبیداللہ چونکہ آنحضرتؐ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں سے تھا' اس لئے اُسے سلطنتِ فاطمیہ کہا جاتا ہے۔ عبیداللہ تاریخ میں مہدی کے لقب سے مشہور ہے۔

عبیداللہ مہدی اور اُن کے پیرو شیعہ فرقے کی ایک شاخ ہے۔ یہ لوگ امام جعفر صادق تک تو تمام اماموں کو مانتے ہیں' لیکن اس کے بعد امام جعفر صادق کے بڑے صاحبزادے اسماعیل کو مانتے ہیں' جبکہ اثنا عشری عقیدے کے مطابق امامت کا سلسلہ امام جعفر صادق کے دوسرے صاحبزادے امام موسیٰ کاظم کی نسل میں چلتا ہے۔ فاطمی خلفاء چونکہ اسماعیل کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے تھے' اس لئے وہ اسماعیلی کہلائے۔ آغا خانی خوجے اسی اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

شروع شروع میں فاطمی حکومت شمالی افریقہ تک محدود رہی' لیکن اُن کے ایک حکمران المعز نے 968ء میں مصر بھی فتح کر لیا۔ وہ فاطمی حکومت کا سب سے قابل حکمران تھا۔ وہ افریقہ سے مصر آ گیا۔ مصر کے موجودہ شہر قاہرہ کی بنیاد اُسی کے عہد میں پڑی۔ یہ شہر فسطاط کے قریب آباد کیا گیا تھا اور فاطمیوں کا دارالحکومت تھا۔ معز کے عہد میں جامع ازہر کے نام سے قاہرہ میں ایک مسجد تعمیر کی گئی' جہاں عزیز باللہ کے عہد میں 975ء میں ایک تعلیمی و دینی درس گاہ قائم کی گئی جو آج تک موجود ہے اور دنیا کے ہر حصے سے مسلمان طلبہ وہاں دینی تعلیم کے لئے جاتے ہیں۔

المعز کے بعد اُس کا لڑکا عزیز باللہ (975ء تا 996ء) تخت پر بیٹھا۔ وہ بھی ایک قابل حکمران تھا۔ اُس کے زمانے میں شام' حجاز' یمن پر بھی فاطمیوں کا قبضہ ہو گیا اور اس طرح فاطمی حکومت اسلامی دنیا کی سب سے بڑی سلطنت بن گئی۔ فاطمیوں کے زمانے میں مسلمانوں کی بحری طاقت نے بڑی ترقی پائی۔ صقلیہ اور اٹلی کا جنوبی حصہ اُن کے قبضے میں تھا۔ فاطمی بیڑے جینوا' روم اور نیپلز پر حملے کرتے رہتے تھے اور یورپ کے بحری بیڑے اُن کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتے تھے۔

عباسی خلافت کے زوال کے دوران جو خودمختار حکومتیں قائم ہوئیں اُن میں فاطمی سلطنت نہ صرف سب سے بڑی اور طاقتور تھی' بلکہ سب سے زیادہ پائیدار بھی تھی۔ یہ حکومت تقریباً پونے تین سو سال قائم رہی۔ 1171ء میں شام کے حکمران نورالدین زنگی نے اس حکومت کا خاتمہ کر دیا' جس کے بعد مصر میں جمعے کے خطبوں میں بغداد کے عباسی خلیفہ کا نام لیا جانے لگا۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں' نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا؟
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!
ولایت' پادشاہی' علم اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں؟ فقط اِک نکتۂ ایماں کی تفسیریں!
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیت ہے
حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!
یقیں محکم' عمل پیہم' محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

خلافت عباسیہ اور سلجوقی ترک

خلافتِ عباسیہ کا عہدِ زوال تقریباً دو سو سال تک پھیلا ہوا ہے۔ ان دو صدیوں کے دوران میں خلافت' جیسا کہ اوپر بیان ہوا' چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتوں میں تقسیم رہی۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ سلجوقی ترکوں نے اسلامی دنیا کو ایک بار پھر متحد کر دیا۔ سلجوق نسلاً ترک تھے اور اسلام قبول کرنے کے بعد وسط ایشیا کے میدانوں سے نکل کر خراسان میں آباد ہو گئے تھے۔ اس وقت خراسان پر غزنوی سلطنت قائم تھی۔

سلجوقی سردار طغرل نے غزنوی حکمران مسعود کو شکست دے کر خراسان میں سلجوقی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ خراسان میں حکومت مضبوط ہو جانے کے بعد طغرل نے مغرب کا رخ کیا اور ایران فتح کرتا ہوا 1055ء میں بغداد میں داخل ہوا جو اس وقت بنی بویہ کے قبضے میں تھا۔

طغرل کے بعد اس کا بھتیجا الپ ارسلان (1063ء تا 1072ء) تخت نشین ہوا۔ الپ ارسلان نے آرمینیا' ایشیائے کوچک' شام اور ماوراُالنہر کو فتح کر کے سلجوقی سلطنت کو وسیع کر دیا۔ اس کے اقتدار کا یہ عالم تھا کہ اس کے نام کا خطبہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں بھی پڑھا جانے لگا جو اس سے پہلے فاطمیوں کے قبضے میں تھے۔

الپ ارسلان نے ایشیائے کوچک کے شہر ملاز کرد کے پاس رومی شہنشاہ ارمانوس کو زبردست شکست دی۔ ارمانوس کے پاس دو لاکھ فوج تھی' جبکہ الپ ارسلان کے پاس صرف پندرہ ہزار فوج تھی۔ جمعہ کا دن تھا۔ سلطان نے پہلے جمعہ کی نماز پڑھی اور اللہ سے فتح کی دعا مانگی۔ اس کے بعد رومیوں کو شکست ہوئی اور ارمانوس گرفتار ہوا۔ ملاز کرد کی جنگ تاریخ کی فیصلہ کن لڑائیوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں پورا ایشیائے کوچک مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا اور یہ خطہ بتدریج ترکوں کا وطن بن گیا۔

الپ ارسلان کے بعد اس کا بیٹا ملک شاہ (1072ء تا 1092ء) اٹھارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں سلجوقی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ مغرب میں شام' جنوب میں یمن اور عمان فتح ہوئے۔ مشرق میں چین تک سلطنت کی حدود پھیل گئیں۔ ملک شاہ نے اپنی سلطنت کا سارا انتظام اپنے وزیر نظام الملک کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ وزیر اپنی خوبیوں میں ہارون الرشید کے برامکہ پر بھی بازی لے گیا۔ نظام الملک کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تعلیم کے فروغ پر خصوصی توجہ دی۔ اس نے سلطنت کے ہر حصے میں بڑے بڑے مدرسے قائم کئے' جو اس کے نام پر ''نظامیہ'' کہلاتے تھے۔ ان مدرسوں میں سب سے بڑا بغداد کا مدرسہ نظامیہ تھا۔ اس مدرسے کے اخراجات کے لئے بہت بڑی جائیداد وقف تھی۔ ہر طالب علم کو وظیفہ دیا جاتا تھا۔ ملک شاہ نے جب دیکھا کہ اس کا وزیر مدرسوں پر بے شمار دولت صرف کر رہا ہے تو ایک دن اس نے کہا: ''بابا! آپ مدرسوں پر جو روپیہ خرچ کر رہے ہیں' اگر وہ فوج پر خرچ کیا جائے تو دنیا فتح ہو سکتی ہے۔'' نظام الملک نے جواب دیا: ''بیٹے! تم جو فوج بھرتی کرو گے' اس کے تیر چند گز سے زیادہ دور نہ جا سکیں گے' لیکن میں اہل علم کی جو فوج تیار کر رہا ہوں' اس کے تیر افلاک کے بھی پار چلے جائیں گے۔''

نظام الملک کو ملک شاہ کے انتقال سے چند ماہ قبل ایک شخص نے جو حسن بن صباح کے باطنی فرقے سے تعلق رکھتا تھا' قتل کر دیا۔ نظام الملک نے ''سیاست نامہ'' اور ''دستور الوزراء'' کے نام سے دو کتابیں لکھی تھیں۔ یہ کتابیں جو فارسی میں ہیں' نظام الملک کے سیاسی تدبر کا شاہکار ہیں اور مسلمانوں کے سیاسی نظریات و افکار کا عمدہ نمونہ۔

ملک شاہ کے انتقال کے بعد اس کے بیٹوں محمود اور برکیارق میں خانہ جنگی ہو گئی۔ اس آپس کی لڑائی سے سلجوقی سلطنت کمزور ہو گئی اور شام' حجاز اور ایشیائے کوچک یا تو سلجوقیوں کے قبضے سے نکل گئے یا مرکزی حکومت کے تسلط سے آزاد ہو گئے۔ سلجوقیوں کی یہ باہمی لڑائی دنیائے اسلام کے لئے بڑی نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اس کی وجہ سے ایک طرف ترکستان اور خراسان کا علاقہ ترکوں کے ایک اور قبیلے ''غز'' نے تاخت و تاراج کر دیا۔ دوسری طرف فلسطین' اردن اور مغربی عراق پر یورپ کی مسیحی اقوام قابض ہو گئیں' اور تیسری طرف خود اندرون ملک بانیوں نے زور پکڑا۔ بالآخر تیرہ سال کی مسلسل خانہ جنگی کے بعد ملک شاہ کے ایک بیٹے محمد (1104ء تا 1117ء) نے سلجوقی سلطنت کے بڑے حصے میں پھر ایک مستحکم حکومت قائم کر دی۔ عراق' آرمینیا' ایران' ترکستان اور افغانستان کا مغربی علاقہ اب بھی اس سلطنت میں موجود تھا۔

سلجوقی ترکوں کا آخری طاقتور حکمران محمد کا بھائی سنجر (1117ء تا 1157ء) تھا۔ اس نے چالیس سال سے زیادہ حکومت کی۔ ترکستان اور خراسان کا علاقہ اس کی براہ راست حکومت میں تھا اور باقی مملکت یعنی ایران اور عراق میں اس کے بھائی اور ان کی اولاد سنجر کی طرف سے حکومت کرتے تھے۔

نیک طینت' عادل اور رعایا پرور سنجر اپنی وسیع سلطنت پر آرام سے حکومت کر رہا تھا کہ 1140ء میں شمال مشرق کی طرف سے ایک غیر مسلم قوم نے جو ''قرہ خطائی'' کہلاتی تھی' نے حملہ کر دیا۔ سنجر نے سمرقند کے قریب مقابلہ کیا' لیکن شکست کھائی' اور ماوراُالنہر کا سارا علاقہ سنجر کے قریب سے نکل گیا۔ سنجر اب بھی باقی سلطنت کو سنبھالے رہا' لیکن بارہ سال بعد تک ایک نومسلم ترک قبیلہ غز باغی ہو گیا۔ سنجر نے 1158ء میں ان کے مقابلے میں شکست کھائی اور غزوں کے ہاتھوں قید ہو گیا۔

غزوں نے اپنی اس کامیابی کے بعد سارے علاقے میں تباہی مچا دی۔ لوگوں کا قتل عام کیا۔ مسجدیں اور مدرسے ڈھا دیئے' شہر اور بستیاں اجاڑ دیں۔ چنگیز خان کے حملے سے قبل خراسان پر ایسی تباہی کبھی نہیں آئی تھی۔ فارسی کے شاعر انوری نے خراسان کی اس تباہی کا بڑا دردناک نقشہ کھینچا ہے۔

چار سال کے بعد سلجوقیوں کا زوال شروع ہو گیا۔ ماوراُالنہر پہلے ہی ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اب خراسان اور عراق بھی ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ ہاں' ان کا ایک خاندان کرمان میں 1187ء تک' دوسرا خاندان کردستان میں 1194ء تک اور تیسرا خاندان ایشیائے کوچک میں 1300ء تک حکومت کرتا رہا۔

ان چھوٹی چھوٹی سلجوقی حکومتوں میں ایشیائے کوچک کی حکومت جو ''سلاجقۂ روم'' کی حکومت کے نام سے مشہور ہے' سب سے بڑی' مضبوط اور پائیدار تھی۔ تاریخ اسلام میں سلاجقۂ روم کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اس زمانے میں یورپ کی قوموں نے مل کر بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لئے جو صلیبی جنگیں شروع کیں' ان کا پہلا نشانہ روم کے یہی سلجوقی مسلمان بنے۔ (صلیبی جنگیں آگے آ رہی ہیں)

سلجوقیوں کے عہد میں بڑے بڑے ترقیاتی کام ہوئے۔ کردستان اور کرمان کے صوبوں کو' جو بہت پسماندہ علاقے تھے' خاص طور پر بڑی ترقی دی گئی۔ اس دور میں دریائے سیحوں سے دریائے فرات تک کے وسیع علاقے میں' جس میں ترکستان' عراق اور ایران کے ملک شامل ہیں' سو سال تک مکمل امن و امان رہا۔ امن و امان کے بعد دوسرا بڑا کارنامہ تعلیم عامہ پر خصوصی توجہ اور مدرسوں کا قیام ہے۔ پہلے تعلیم کا انتظام مسجدوں کے اندر ہوتا تھا' لیکن سلجوقی دور میں لائق وزیر اعظم نظام الملک نے مدرسوں کے لئے

باقاعدہ عمارتیں بنوائیں۔ چنانچہ چند سال کے اندر اندر سرکاری امداد سے ساری سلطنت میں مدرسوں کا جال بچھادیا گیا۔ سلجوقیوں سے پہلے دنیا کے کسی حصے میں اس کثرت سے مدرسے کبھی قائم نہیں ہوئے تھے۔

سلجوقی عہد میں علم و ادب کی بھی خوب سرپرستی کی گئی۔ فارسی کے درجۂ اول کے شاعر معزّی' انوری' نظامی اور خاقانی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس دور میں جو بڑے اہلِ علم ہوئے ہیں' ان میں امام غزالی' غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ' عمر خیام' مولانا جلال الدین رومی (مثنوی والے)' جاراللہ زمخشری' محمد بن عبدالکریم شہرستانی' حریری عراقی اور عبداللہ انصاری قابل ذکر ہیں۔

صلیبی جنگیں

بیت المقدس پر مسلمانوں نے حضرت عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں' کسی لڑائی کے بغیر' صلح کے ذریعے قبضہ کیا تھا (تفصیل جاننے کے لئے ملاحظہ ہو "ندائے خلافت" کا فلسطین نمبر) یہ قبضہ سلجوقیوں کے زمانے تک قائم رہا' لیکن ملک شاہ کے انتقال کے بعد جب سلجوقیوں کو زوال ہوا تو شام اور ایشیائے کوچک ایک بار پھر چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم و منتشر ہو گئے۔ یہ حکومتیں آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ جب عیسائیوں نے مسلمانوں کی یہ کمزوری دیکھی تو انہوں نے فلسطین کو مسلمانوں کے قبضے سے واپس لینے کی کوشش شروع کر دی۔ فلسطین اور خاص طور پر بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے لئے عیسائیوں نے جو لڑائیاں لڑیں تو وہ صلیبی جنگیں (Crusades) کہلاتی ہیں اور یہ نام بھی عیسائیوں ہی نے صلیب مقدس کے نام پر احتراماً رکھا تھا۔

اس زمانے میں عیسائیوں کی حکومت صرف یورپ تک محدود تھی۔ سلجوقیوں کے زوال کے بعد جرمنی' فرانس' اٹلی اور یورپ کے دوسرے ملکوں سے ایک زبردست فوج بیت المقدس روانہ ہوئی۔ پہلی فوج کو تو مقصد میں کامیابی نہ ہوئی اور اسے روم کے سلجوقی ترکوں نے ختم کر دیا' لیکن دوسری فوج روانہ ہوئی تو مسلمان آپس کی خانہ جنگی اور نااتفاقی کی وجہ سے عیسائیوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ عیسائیوں نے ایشیائے کوچک اور شام کا علاقہ فتح کر کے 1098ء میں بیت المقدس بھی فتح کر لیا۔ یہ پہلی صلیبی جنگ تھی۔ عیسائی سپاہیوں نے مسلمان مردوں اور عورتوں اور بچوں کا قتل عام کیا۔ یہ پہلی صلیبی جنگ تھی۔ عیسائی سپاہیوں نے مسلمان مردوں اور عورتوں بچوں کا قتل عام کیا۔ جن لوگوں نے مسجدِ اقصیٰ میں پناہ لی' ان کو بھی چن چن کر شہید کیا گیا۔ اس قتلِ عام میں 70 ہزار مسلمان شہید ہوئے۔ یورپ کے عیسائیوں نے اب پورے فلسطین اور شام کے ساحلی علاقے میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

بیت المقدس پر قبضہ جمانے کے لئے یورپ کے عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان آٹھ صلیبی جنگیں ہوئیں' ان کا مختصر تعارف یہ ہے:۔

(1) پہلی جنگ (1096ء تا 1099ء) میں یورپ کی متحدہ فوجوں نے بیت المقدس' فلسطین اور شام کے علاقے فتح کر لئے۔

(2) دوسری جنگ (1147ء تا 1149ء) عمادالدین زنگی کی کامیابیوں کو روکنے کے لئے لڑی گئی۔ اس جنگ کی قیادت جرمنی کے شہنشاہ کونریڈ سوم اور فرانس کے بادشاہ لوئی سوم نے کی۔ عمادالدین کا انتقال ہو گیا تھا' اس لئے اس کے لڑکے نورالدین زنگی کو اس متحدہ عیسائی فوج کا مقابلہ کرنا پڑا۔ صلیبیوں کو کامیابی نہیں ہوئی۔

(3) تیسری جنگ (1189ء تا 1192ء) سب سے بڑی اور مشہور ہے۔ یہ اس وقت شروع کی گئی تھی جب صلاح الدین ایوبی نے بیت المقدس فتح کر لیا۔ اتحادیوں کی قیادت برطانیہ کے رچرڈ شیر دل' فرانس کے بادشاہ فلپ اور جرمنی کے شہنشاہ فریڈرک باربروسہ نے کی۔ فریڈرک ایشیائے کوچک میں ایک دریا میں ڈوب گیا۔ رچرڈ اور فلپ بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

(4) چوتھی جنگ (1202ء تا 1204ء) اس جنگ میں یورپ کے صلیبی مجاہد آپس میں لڑ پڑے۔ یورپ کے شہروں میں انہوں نے لوٹ مار اور قتل و غارت کی اور بیت المقدس کی بجائے یورپ کے مسیحی شہر قسطنطنیہ کو فتح کر لیا۔

(5) پانچویں جنگ (1218ء تا 1221ء) اس جنگ کے دوران یورپ کے متحدہ صلیبی لشکر نے مصر پر حملہ کیا۔ ملک کامل ایوبی نے شکست دی۔

(6) چھٹی جنگ (1228ء تا 1229ء) جرمنی کا شہنشاہ فریڈرک دوم متحدہ لشکر کا قائد تھا۔ جنگ ہوئی اور ملک کامل نے باہمی تصفیہ کے ذریعے بیت المقدس عیسائیوں کے سپرد کر دیا' لیکن ملک کامل کے بعد مسلمانوں نے شہر واپس لے لیا۔

(7) ساتویں جنگ (1248ء تا 1249ء) اس مہم کا قائد فرانس کا بادشاہ لوئی نہم تھا۔ مصر پر حملہ کیا گیا۔ ملک الصالح ایوبی نے مقابلہ کیا۔ شہنشاہ لوئی گرفتار ہوا اور فدیہ دے کر رہا ہوا۔

(8) آٹھویں جنگ (1270ء تا 1271ء) لوئی نہم نے رہائی کے بعد پھر ایک اور کوشش کی۔ اس مرتبہ انگلستان کا بادشاہ ایڈورڈ بھی شامل تھا' لیکن اس نے تیونس کا رُخ کیا اور وہیں لوئی نے وفات پائی اور یہ آخری صلیبی جنگ بھی ناکام رہی۔

ان آٹھ جنگوں کے علاوہ ایک اور جنگ قابلِ ذکر ہے جو بچوں کی صلیبی جنگ کہلاتی ہے۔ یورپ والوں کا خیال تھا کہ بڑے لوگ چونکہ گناہوں کے کام کرتے ہیں' اس لئے خدا ان کو مسلمانوں کے مقابلے میں کامیابی نہیں دیتا' اس لئے انہوں نے معصوم اور نابالغ بچوں کی ایک فوج 1212ء میں فرانس سے بھیجی' لیکن مارسلز کی بندرگاہ تک پہنچتے پہنچتے یہ بچے پریشان اور تتر بتر ہو گئے۔ خود عیسائیوں نے ان کے ساتھ بدسلوکی کی۔ لوٹ مار کی اور غلام بنا کر بیچ ڈالا۔ بچوں کی صلیبی جنگ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس زمانے میں یورپی اقوام ذہنی اور اخلاقی لحاظ سے کس قدر پست تھیں۔

صلیبیوں کا قبضہ فلسطین اور شام کے ساحلی علاقے تک محدود رہا۔ وہ شام کے اندرونی شہروں حلب' حماۃ' حمص' بعلبک اور دمشق پر کبھی قابض نہ ہو سکے۔ عیسائیوں نے مقبوضہ علاقے میں ذیل کی چار ریاستیں قائم کر لیں جو "لاطینی ریاستیں" کہلاتی تھیں:

(1) پہلی ریاست 1097ء میں قائم ہوئی۔ اس کا صدر مقام الرھا تھا۔

(2) دوسری ریاست 1098ء میں قائم ہوئی۔ اس کا صدر مقام انطاکیہ تھا۔

(3) تیسری ریاست فلسطین کی تھی جو 1099ء میں قائم ہوئی۔ اس کا صدر مقام یروشلم تھا۔

(4) چوتھی ریاست 1109ء میں قائم ہوئی۔ اس کا صدر مقام طرابلس الشام تھا۔

ان ریاستوں میں فلسطین کی ریاست سب سے بڑی تھی۔ اس کے حکمران کی حیثیت شہنشاہ کی تھی اور باقی تین ریاستیں رسمی طور پر یروشلم کی بالادستی کو تسلیم کرتی تھیں۔

صلیبی جنگوں کے دو بڑے گروہ تھے۔ ایک گروہ ہیکلی کہلاتا تھا۔ اس لئے کہ انہوں نے یروشلم میں ہیکل سلیمانی کے قریب رہنا شروع کر دیا تھا۔ دوسرا ہاسپٹیلرز کہلاتا تھا۔ ہاسپٹل اس زمانے میں مہمان خانے کو کہتے تھے اور یہاں لوگ زائرین کی مہمان داری کرتے تھے' پھر انہوں نے جنگی گروہ کی حیثیت اختیار کر لی۔

جب 1098ء میں فلسطین اور بیت المقدس پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا تو دنیائے اسلام میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔ فلسطین اسلامی دنیا کا دل ہے۔ نقشے پر دیکھیں تو معلوم ہو گا کہ اگرچہ فلسطین ایک چھوٹا سا علاقہ ہے' لیکن ایسی جگہ واقع ہے کہ اگر اس پر غیر مسلموں کا قبضہ ہو جائے تو اسلامی دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ مصر اور شمالی افریقہ کے مسلمان پھر خشکی کے راستے عرب' عراق اور ایران وغیرہ کے ملکوں میں آ جا نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ

یروشلم مسلمانوں کے لئے بڑا مقدس مقام ہے' اس لئے اس کو مسلمان قبلۂ اوّل کہتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ' حضرت داؤدؑ' حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت عیسیٰؑ اسی خطے میں ظہور پذیر ہوئے ہیں اور جس طرح وہ عیسائی اور یہودیوں کے پیغمبر ہیں' اسی طرح مسلمانوں کے بھی پیغمبر ہیں۔ پھر خود جب رسول کریمؐ کو معراج نصیب ہوئی تو انہوں نے مسجد اقصیٰ ہی میں قیام کیا تھا اور یہاں سے آسمان پر تشریف لے گئے تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں کے لئے ممکن نہ تھا کہ وہ فلسطین پر عیسائیوں کا قبضہ خاموشی کے ساتھ گوارا کر لیتے۔ انہوں نے عیسائیوں کا مقابلہ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

جن مشاہیر نے عیسائیوں کے مقابلے میں نام پیدا کیا' ان میں پہلا شخص عمادالدین زنگی (1127ء تا 1146ء) ہے۔ عمادالدین سلجوقی حکومت کی طرف سے شہر موصل (عراق) کا حاکم تھا۔ جب سلجوقی حکومت کمزور ہوگئی تو اس نے اپنی سلطنت بہت بڑھالی اور عیسائیوں کو شکست پر شکست دے کر ان کی چار ریاستوں میں سے ایک ریاست ختم کر دی جس کا مرکز شہر الرھا تھا' جسے آج کل ''اورفا'' کہتے ہیں' اور ایشیائے کوچک کے جنوب میں واقع ہے' لیکن بدقسمتی سے عمادالدین کا اس عرصے میں انتقال ہو گیا اور وہ فلسطین تک نہ پہنچ سکا۔ عمادالدین کی ساری عمر لڑائیوں میں گزری۔ وہ میدان جنگ کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ اکثر کہا کرتا تھا: ''مجھے قالینوں سے زیادہ گھوڑے کی پیٹھ پر اور نغمہ وساز سے زیادہ تلواروں کی جھنکار میں مزا آتا ہے۔''

نورالدین زنگی (1146ء تا 1173ء)

عمادالدین کے بعد اس کے بیٹے نورالدین زنگی نے بڑا نام پیدا کیا۔ اس نے عیسائیوں سے بیت المقدس واپس لینے سے پہلے ایک مضبوط حکومت قائم کرنے کی کوشش کی اور یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے نورالدین نے گردونواح کی چھوٹی چھوٹی مسلم حکومتوں کو ختم کر کے ان کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا۔ شروع میں نورالدین کا دارالحکومت حلب (شام) تھا۔ 1154ء میں اس نے دمشق پر قبضہ کر کے اسے دارالحکومت قرار دیا۔ اس زمانے میں مصر میں فاطمی حکومت قائم تھی' لیکن اب وہ بھی بالکل کمزور ہوگئی تھی اور مصر چونکہ فلسطین سے ملا ہوا تھا' اس لئے عیسائی اس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ یہ دیکھ کر نورالدین نے ایک فوج بھیج کر 1168ء میں مصر پر بھی قبضہ کر لیا اور فاطمی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

مصر پر قبضہ کرنے کے بعد نورالدین نے بیت المقدس پر حملہ کرنے کی تیاریاں شروع کیں۔ بیت المقدس کی مسجد عمرؓ میں رکھنے کے لئے اس نے اعلیٰ درجے کا منبر تیار کروایا۔ اس کی خواہش تھی کہ فتح بیت المقدس کے بعد

خلافتِ عباسیہ (750ء تا 1258ء)

عہدِ عروج (750ء تا 861ء)

1- ابوالعباس سفاح	(750ء تا 754ء)
2- ابوجعفر منصور	(754ء تا 775ء)
3- محمد مہدی	(775ء تا 785ء)
4- موسیٰ ہادی	(785ء تا 786ء)
5- ہارون الرشید	(786ء تا 809ء)
6- امین الرشید	(809ء تا 813ء)
7- مامون الرشید	(813ء تا 833ء)
8- معتصم باللہ	(833ء تا 842ء)
9- واثق باللہ	(842ء تا 847ء)
10- متوکل علی اللہ	(847ء تا 861ء)

عہدِ زوال (861ء تا 945ء)

11- مستنصر باللہ	(861ء تا 862ء)
12- مستعین باللہ	(862ء تا 866ء)
13- معتز باللہ	(866ء تا 869ء)
14- مہتدی باللہ	(869ء تا 870ء)
15- معتمد علی اللہ	(870ء تا 892ء)
16- معتضد باللہ	(892ء تا 902ء)
17- مکتفی باللہ	(902ء تا 908ء)
18- مقتدر باللہ	(908ء تا 932ء)
19- قاہر باللہ	(932ء تا 934ء)
20- راضی باللہ	(934ء تا 940ء)
21- متقی للہ	(940ء تا 944ء)

عہدِ محکومی (946ء تا 1152ء)

1- سامانی	(874ء تا 1005ء)
2- بنی بویہ	(934ء تا 1005ء)
3- سلطنتِ فاطمیہ	(909ء تا 1171ء)

دوسرا عہدِ عروج (1152ء تا 1258ء)

1- مقتفی لامراللہ	(1136ء تا 1160ء)
2- مستنجد باللہ	(1160ء تا 1170ء)
3- مستضی باللہ	(1170ء تا 1180ء)
4- الناصر الدین باللہ	(1180ء تا 1225ء)
5- ظاہر بامراللہ	(1225ء تا 1226ء)
6- مستنصر باللہ	(1226ء تا 1242ء)
7- مستعصم باللہ	(1242ء تا 1258ء)

اس منبر کو ہاتھ سے مسجد میں رکھے گا' لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ نورالدین ابھی حملے کی تیاریاں ہی کر رہا تھا کہ اس کا انتقال ہوگیا۔

صلاح الدین ایوبی (1173ء تا 1193ء)

صلیبی جنگوں میں سب سے زیادہ شہرت جس شخص کو حاصل ہوئی وہ سلطان صلاح الدین ایوبی فاتح بیت المقدس ہے۔ صلاح الدین نسلاً کرد تھا اور کردستان کے اس حصے میں پیدا ہوا تھا جو عراق میں شامل ہے۔ جائے پیدائش کرکوک ہے۔ یہیں عراق کا موجودہ صدر صدام حسین بھی پیدا ہوا۔ صلاح الدین شروع میں سلطان نورالدین زنگی کے یہاں ایک فوجی افسر تھا۔ مصر کو جس فوج نے فتح کیا تھا' اس میں صلاح الدین موجود تھا اور اس فوج کا سپہ سالار شیرکوہ صلاح الدین کا چچا تھا۔ مصر فتح ہو جانے کے بعد صلاح الدین 1168ء میں مصر کا حاکم مقرر کیا گیا۔ اسی زمانے میں 1173ء میں اس نے یمن بھی فتح کر لیا۔ نورالدین کے انتقال کے بعد چونکہ اس کی کوئی لائق اولاد نہ تھی' اس لئے صلاح الدین پوری سلطنت پر قابض ہوگیا۔

صلاح الدین میں جہاد کا شوق و جوش کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور بیت المقدس کی فتح اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا تھی۔ فلسطین اب ہر طرف سے گھر گیا تھا' اس لئے اب اس نے بیت المقدس کا رخ کیا۔ حطین کے میدانِ جنگ میں عیسائیوں سے بڑا معرکہ ہوا۔ عیسائیوں کو شکست ہوئی۔ ان کے کئی ہزار آدمی مارے گئے اور کئی ہزار گرفتار ہوئے۔ صلاح الدین نے آگے بڑھ کر آسانی سے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا اور تمام فلسطین سے مسیحی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ مسجد اقصیٰ میں داخل ہو کر صلاح الدین نے وہ منبر جسے نورالدین نے بڑے شوق سے بنوایا تھا' اپنے ہاتھ سے مسجد میں رکھا۔ اس طرح نورالدین کی خواہش صلاح الدین کے ہاتھوں پوری ہوئی۔

صلاح الدین نے بیت المقدس میں داخل ہو کر وہ مظالم نہیں کئے جو اس شہر پر قبضے کے وقت یورپ کے عیسائی فوجیوں نے مسلمانوں پر کئے تھے یا آج اسرائیل کے صیہونی کر رہے ہیں۔ صلاح الدین ایک مثالی فاتح کی حیثیت سے بیت المقدس میں داخل ہوا۔ اس نے فدیہ لے کر ہر عیسائی کو امان دی اور جو غرباء فدیہ ادا نہ کر سکے' ان کے فدیہ کی رقم صلاح الدین اور اس کے بھائی ملک عادل نے خود ادا کی۔

بیت المقدس پر قبضے کے ساتھ یروشلم کی وہ مسیحی حکومت بھی ختم ہوگئی' جو فلسطین میں 1099ء سے قائم تھی۔ اس کے بعد جلد ہی سارا فلسطین مسلمانوں کے قبضے میں آ گیا اور عیسائیوں کے پاس صرف ساحلی علاقہ باقی رہا۔

جب بیت المقدس پر قبضے کی خبر یورپ پہنچی تو سارے یورپ میں کہرام مچ گیا۔ ہر طرف لڑائی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ جرمنی' اٹلی' فرانس اور انگلستان سے فوجوں پر فوجیں فلسطین روانہ ہونے لگیں۔ انگلستان کا بادشاہ رچرڈ' جو اپنی بہادری کی وجہ سے شیر دل مشہور تھا اور فرانس کا بادشاہ فلپ اپنی اپنی فوجیں لے کر فلسطین پہنچے۔ یورپ کی اس متحدہ فوج کا (جس کی تعداد 6 لاکھ تھی) صلاح الدین نے تین سال تک تنہا مقابلہ کیا' لیکن عیسائی بیت المقدس لینے میں کامیاب نہ ہوئے اور سلطان سے صلح کر کے ناکام و نامراد واپس چلے گئے۔ یہ لڑائی ''تیسری صلیبی جنگ'' کہلاتی ہے۔

صلاح الدین بڑا بہادر اور فیاض تھا۔ اس نے لڑائیوں میں عیسائیوں کے ساتھ اعلیٰ ظرفی کا ایسا سلوک کیا کہ عیسائی آج بھی اس کی عزت کرتے ہیں۔ مسیحیوں کو اس نے بیت المقدس جانے کی اجازت دے دی۔ اجازت ملنے پر یورپ کے زائرین جو برسوں سے انتظار کر رہے تھے' اس کثرت سے ٹوٹ پڑے کہ شاہ رچرڈ کے لئے انتظام قائم رکھنا مشکل ہوگیا۔ سلطان صلاح الدین نے نہ صرف یہ کہ ان زائرین کو ہر قسم کی آزادی دے دی' بلکہ اپنی جانب سے لاکھوں زائرین کی مدارات' راحت و آسائش اور دعوت کا انتظام کیا۔

صلاح الدین ایوبی' شہاب الدین غوری اور مراکشی حکمران یعقوب منصور کا ہم عصر تھا اور اس میں شک نہیں کہ یہ تینوں حکمران اپنے وقت میں دنیا کے عظیم ترین حکمران تھے۔ 1193ء میں صلاح الدین کا انتقال ہوا۔ مورخ ابن خلکان نے اپنی کتاب میں لکھا: ''اس کی موت کا دن اتنا تکلیف دہ تھا کہ ایسا تکلیف دہ دن اسلام اور مسلمانوں پر خلفائے راشدین کی موت کے بعد کبھی نہیں آیا۔''

خوارزم شاہی سلطنت

سلجوقیوں کے زوال کے بعد دنیائے اسلام کے مشرقی حصے میں جو حکومتیں قائم ہوئیں' ان میں کارناموں کے لحاظ سے اگرچہ شام و مصر کی زنگی' ایوبی اور ہرات کی غوری حکومت زیادہ اہم ہیں' لیکن رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑی حکومت خوارزم کی تھی۔ اس حکومت کی بنیاد خوارزم کے سلجوقی حاکم اتسز نے سلطان سنجر کے انتقال کے بعد ڈالی تھی۔ خوارزم کے دو بادشاہوں علاؤالدین تکش (1172ء تا 1200ء) اور علاؤالدین محمد خوارزم شاہ (1200ء تا 1220ء) نے اپنی سلطنت کو بہت بڑھایا۔ علاؤالدین نے خراسان فتح کر لیا اور محمد خوارزم شاہ نے ایک طرف شہاب الدین غوری کے انتقال کے بعد ہرات اور غزنی کو غوریوں سے چھین لیا اور دوسری طرف ماوراءالنہر کے علاقے سے قرہ خطائیوں کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ یہ قرہ خطائی وہی تھے جنہوں نے سلطان سنجر سلجوقی کو شکست دے کر ماوراءالنہر پر قبضہ کر لیا تھا۔ خوارزم شاہ اب بغداد پر بھی قبضہ کرنا چاہتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلامی دنیا کا بڑا حصہ اب پھر متحد ہو جائے گا' لیکن خدا کو یہ منظور نہیں تھا۔

محمد خوارزم شاہ کے عہد میں منگولیا سے چین تک ایک جنگجو چنگیز خان (1206ء تا 1227ء) نے ایک زبردست حکومت قائم کر لی تھی اور چین بھی فتح کر لیا تھا۔ یہ منگولوں کی حکومت تھی جو منگولیا کے رہنے والے تھے۔ یہ منگول کافر' بڑے وحشی' اجڈ اور خونخوار تھے۔ چنگیز خان اچھے اچھے کپڑوں کا شوقین تھا اور یہ کپڑے چونکہ اسلامی ملکوں میں بنتے تھے' اس لئے اس نے ایک مرتبہ کچھ منگول تاجروں کو خوارزم بھیجا۔ خوارزم شاہ نے ان کو جاسوس سمجھ کر قتل کروا دیا۔ اس پر چنگیز خان کو بڑا طیش آیا۔ بات تھی بھی طیش کی۔ تاجروں کو بغیر کسی گناہ کے قتل کروا دینا کوئی انصاف کی بات نہ تھی۔ چنگیز خان نے اس حرکت کا جواب طلب کیا' لیکن خوارزم شاہ نے اس کے قاصد کو بھی قتل کروا دیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ چنگیز خان وحشی منگولوں کی زبردست فوج لے کر چڑھ آیا اور خوارزم شاہ کی سلطنت پر حملہ کر دیا۔ اس طرح خوارزم شاہ کی وجہ سے دنیائے اسلام کو بڑی تباہی و بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔ خوارزم شاہ ایسا ظلم نہ کرتا تو وحشی منگول حملہ نہ کرتے۔ اس کی ذرا سی غلطی سے لاکھوں انسانوں کو نقصان پہنچا۔ سب سے بری بات یہ ہوئی کہ خوارزم شاہ نے چنگیز خان سے چھیڑ تو شروع کر دی لیکن جب اس نے حملہ کیا تو ایک جگہ بھی میدان جنگ میں آ کر اس کا مقابلہ نہیں کیا۔ چنگیز خان شہر پر شہر فتح کرتا جاتا اور وہ اس کے آگے آگے بھاگتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ بحیرۂ خضر کے ایک جزیرے آبسکون میں جا کر پناہ لی اور وہیں 1220ء میں انتقال ہوا۔

محمد خوارزم شاہ کے بعد اس کے بیٹے جلال الدین خوارزم شاہ نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ کئی سال تک منگولوں سے لڑتا رہا' لیکن وہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔

منگولوں کا یہ حملہ بہت بڑی تباہی لایا۔ سمرقند' بخارا' خوارزم' بلخ' نیشاپور' غرض اسلامی دنیا کے وہ تمام شہر جو وسط ایشیا اور ایران میں تھے' انہوں نے برباد کر دیئے' لوگوں کا قتل عام کیا۔ شہروں کو نذرِ آتش کر دیا۔ عمارتیں منہدم کر دیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلامی دنیا کا ایک بڑا حصہ ویران اور خاکستر کر دیا۔ مسجدیں' کتب خانے اور مدرسے سب برباد کر دیئے گئے۔

خوارزم شاہ کی سلطنت' وسط ایشیا اور ایران کے شہر تباہ و برباد کر کے چنگیز خان واپس منگولیا چلا گیا اور 1227ء میں مر گیا۔ لیکن تیس سال بعد اس کے پوتے ہلاکو خان نے

اب عراق اور اس کے دارالحکومت بغداد پر قبضہ کرلیا' جو اس وقت اسلامی دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا۔

سقوطِ بغداد

سلجوقیوں کے بعد بغداد کے خلیفہ پھر خودمختار ہو گئے تھے۔ آخری عباسی خلفاء کی سلطنت زیادہ بڑی نہیں تھی۔ وہ صرف عراق پر حکومت کرتے تھے۔ بغداد' بصرہ اور کوفہ ان کی قبضے میں تھے۔ آخری دور کے عباسی خلفاء کی تعداد سات ہے اور جیسا کہ ملوکیت و بادشاہت کا دستور ہے کہ دو چار بادشاہ اچھے ہوتے ہیں' اور زیادہ تر نالائق اور عیاش ہوتے ہیں' ان خلفاء کی صورتِ حال بھی یہی تھی۔ صرف چھٹا بادشاہ مستنصر باللہ نیک نام اور رعایا پرور تھا۔ اس نے سترہ سال حکومت کی۔ اس کے عہد میں بکثرت مسجدیں' خانقاہیں' مسافر خانے' سرائے اور شفاخانے تعمیر کئے گئے۔ اس نے بغداد میں ایک ایسا مدرسہ بنایا جس کے آگے نظام الملک کا ''مدرسہ نظامیہ'' بھی ماند پڑ گیا۔ اس مدرسے کا نام خلیفہ کے نام پر ''مدرسہ مستنصریہ'' تھا۔ اس مدرسے کی عمارت سات سال میں مکمل ہوئی۔ مدرسے کا کتب خانہ اتنا بڑا تھا کہ اس کے ساٹھ اونٹوں پر کتابیں لد کر آئیں۔

ساتویں اور آخری خلیفہ مستعصم باللہ میں حکومت کی صلاحیت نہ تھی۔ نااہل' مغرور اور احمق تھا۔ ''تاریخ اوصاف'' میں لکھا ہے: ''وہ زیادہ سے زیادہ عیش کوشی' تن آسانی' نشاط پسندی' مال و دولت کا حریص' اشیاء و جواہرات کا شوقین اور عظمت و تکبر کا مالک تھا۔ چار سو خادم مستقل طور پر دربار کی ملازمت میں مشغول رہتے تھے۔ کسی کو مجال نہ تھی' خواہ وہ کسی ملک کا شہنشاہ ہی کیوں نہ ہو کہ امیر المومنین کے دربار میں باریابی پا سکے۔ شاہی محل کے قپوں کے سامنے شاہراہ پر ایک پتھر حجر اسود کی طرح رکھا رہتا تھا اور سیاہ اطلس کا ایک تھان' کھڑکی سے آستین کی طرح اس پتھر کو چھوتا رہتا تھا۔ اطراف کے سلاطین میں سے جو بھی بارگاہ میں حاضری کا خواہاں ہوتا' وہ اس سیاہ اطلس کے پردے کی زیارت کرتا اور پتھر کو بوسہ دے کر واپس چلا جاتا۔ صرف عیدین کے موقع پر خلیفہ باہر نکلتا۔ اس موقع پر براق صورت اور برق رفتار شاہی گھوڑوں کو سونے چاندی کے طوقوں اور بندوں سے سجایا جاتا۔ گھوڑے زیورات اور سجاوٹ میں ڈوبے ہوتے تھے۔ بڑے بڑے سردار' امراء' مشائخ گروہ در گروہ خلیفہ کی معیت میں ہوتے تھے۔ عام اور خاص لوگ پہلے ہی سے وہ مکانات' بالاخانے' پنجرے' کھڑکیاں اور چھتیں کرائے پر حاصل کرتے اور شاہی جلوس کا نظارہ کرتے جو دیکھنے کے قابل ہوتا۔ خلیفہ معتصم بدعت' عیش اور لہولعب کی باتوں سے لطف اٹھانے کا عادی تھا۔

منگولیا سے چنگیز خان کی شکل میں عالم اسلام کی پکی ہوئی کھیتی کو اجاڑنے کے لئے جو زرد اور گرم طوفان اٹھا تھا' وہ ہلاکو خان کے وجود میں خوفناک آندھی بن کر بغداد پر چھا گیا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ ہلاکو خان کی ایک چہیتی بیوی عیسائی تھی' جس کی خواہش پر ہلاکو نے اسلامی طاقت کو مٹانے کا عزم کیا تھا اور یورپ کے صلیبیوں سے ساز باز کی تھی۔ صلیبی جنگوں میں ہزیمت اٹھانے والی یورپی اقوام اور روم کے پاپائے اعظم نے ہلاکو خان کو مسلسل کمک فراہم کی تھی' تاکہ مسلمانوں سے انتقام لیا جاسکے۔ بغداد پر حملے کے وقت عیسائی فوج تاتاریوں کے شانہ بشانہ مسلمانوں کے قتل عام اور لوٹ مار میں شریک تھی۔

''تاریخ وصناف'' کا مصنف لکھتا ہے کہ خلیفہ مستعصم کا وزیر ابن علقمی بڑا فاضل شخص تھا۔ منقولات و معقولات میں یگانہ روزگار تھا۔ احوالِ سلطنت میں خودمختار تھا۔ متعصب شیعہ تھا۔ اس کے دل میں خاندانِ خلیفہ کے خلاف گرہ پڑ چکی تھی اور کھوج میں تھا کہ کسی طرح خلیفہ اور اس کے خاندان سے انتقام لے۔

جب حسن بن صباح کے ''قلعہ الموت'' کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے بعد ہلاکو بغداد کی طرف متوجہ ہوا تو ابن علقمی نے ہلاکو کی طرف خفیہ پرچہ بھیجا' جس میں اس نے دلائل کے ساتھ کہا کہ اگر چہ بغداد پر حملہ آور ہو تو وہ اسے بڑی آسانی سے فتح کرلے گا اور یہ کہ اس سلسلے میں اس کی ہر ممکن مدد کی جائے گی۔ اس کے باوجود فوری طور پر ہلاکو خان کو ابن علقمی کی باتوں پر یقین نہ آیا' کیونکہ وہ بغداد کی مضبوطی' سطوت اور استحکام کی شہرت سن چکا تھا اور اسے یہ بھی علم تھا کہ مرکز خلافت ہونے کی وجہ سے مسلمان اس کے دفاع میں سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔ اس کے باوجود ابن علقمی قاصد پہ قاصد خفیہ طور پر بھیج کر ہلاکو خان کو حملے کی دعوت دیتا رہا اور اپنے آدمیوں کی طرف سے خفیہ حمایت کی یقین دہانیاں کراتا رہا۔ ایک خط میں اس نے ہلاکو کو لکھا: ''میں خلیفہ کے ساتھ مل کر اور بناوٹ کا طریقہ اختیار کروں گا۔ آپ کو چاہئے کہ کسی قسم کے تساہل اور تاخیر کے بغیر اپنے لشکر اور پرچم کے ساتھ اس طرف مارچ شروع کریں۔'' ہلاکو خان نے اپنے مشیروں سے مشورے کے بعد بغداد کا رخ کرلیا۔

جب ہلاکو خان کا لشکر بغداد پر چڑھ دوڑا' محاصرے نے طول کھینچا۔ بغداد کے شہری عاجز آ گئے' خلیفہ کی ہمت جواب دینے لگی' تو ہلاکو کے ساتھ طے شدہ منصوبے کے مطابق ابن علقمی نے خلیفہ کو مشورہ دیا کہ ہلاکو سے ملاقات کر لی جائے تو اس کی سلطنت محفوظ رہے گی' بلکہ ہلاکو ممنون ہو گا۔ ساتھ ہی اس نے خلیفہ کے سامنے منگول لشکر کی تعداد اور دہشت انگیزی کی ایک خوفناک تصویر کھینچی۔ اس نے کہا: ''امیر المومنین' منگولوں کا لشکر شمار سے باہر ہے' جبکہ ہمارا شہر لشکر سے خالی ہے (دراصل ابن علقمی ہی کے منصب کے تحت چند روز پہلے شاہی لشکر بغداد سے باہر نکال کر اطراف میں بھیج دیا گیا تھا) غلاموں اور دوسرے لوگوں نے دفاع کی پوری کوشش کرلی ہے' لیکن آج کے بعد مزاحمت ممکن نہ ہوگی' کیونکہ مغلوں کا غلبہ بڑھتا جاتا ہے اور انہیں باہر سے بھی مدد حاصل ہو رہی ہے' جبکہ اہل بغداد کی مزاحمت کمزور پڑ رہی ہے۔ اب سلامتی کی تدبیر یہ ہے کہ امیر المومنین لڑائی چھوڑ دیں اور مصالحت کی راہ اختیار کریں۔ مناسب یہ ہے کہ مزید تاخیر کے بغیر امیر المومنین ہلاکو خان کے پاس چلے جائیں' کیونکہ تاتاری یورش کا مقصد مال و اسباب کا حصول ہے' جبکہ خلیفہ کے پاس مال و دولت کی کمی نہیں' تو پھر لڑائی کی کیا ضرورت ہے؟ مزید انس و محبت کے لئے سمدھیانہ اور رشتہ داری قائم کرنا اچھی تدبیر ہے۔ ہلاکو خان کے خاندان کی لڑکی امیر المومنین کے شہزادے کے عقد میں آ جائے اور خاندان خلافت کی کوئی لڑکی ہلاکو کے لڑکے کے نکاح میں چلی جائے۔ اس طرح آپ کی خلافت اور ہلاکو کی بادشاہت یکجا ہو جانے سے ہزاروں مسلمانوں کی جان و مال محفوظ ہو جائے گی اور خلافت کی عظمت میں مزید ترقی ہو گی۔'' منگولوں کی ٹڈی دل فوج اور دہشت کا تذکرہ وہ وزیر کر رہا تھا جس نے حملے سے چند روز پہلے شاہی فوج کو بغداد سے باہر نکلوانے کا منصوبہ پیش کرتے وقت کہا تھا کہ بغداد کی عورتیں اور نابالغ بچے بھی اگر ایک ایک اینٹ اٹھا لیں تو ہلاکو کی فوج تباہ ہو جائے گی۔

ایک غیرت مند کرد امیر ملک عزالدین نے تمام رکاوٹوں اور خلیفہ بغداد کی بے حسی کے باوجود کسی نہ کسی طرح بغداد میں بیس ہزار فوج تیار کی۔ یہ فوج بغداد کے گردونواح کے دیہات اور قصبوں میں مسلمانوں کے ساتھ مل کر ہلاکو کے لشکر پر حملہ آور ہوئی اور چند جھڑپوں میں کامیابی بھی حاصل کی۔ دجلہ عبور کر کے جس جگہ اس اسلامی لشکر نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا' اس کے قریب ایک نہر تھی جو دریائے فرات سے نکل کر بغداد کی طرف آتی تھی۔ مسلمانوں کی لشکر گاہ نشیب میں تھی' جبکہ نہر ذرا اونچائی پر تھی۔ غدار وزیر ابن علقمی نے رات کے وقت اپنے آدمیوں کو بھیج کر نہر کا پانی اسلامی لشکر کی طرف چھوڑ دیا۔ فوج کا اسلحہ خراب ہو گیا اور بھیگنے سے سپاہ بھی بے بس ہو گئے۔ صبح کے وقت تاتاریوں نے پلٹ کر حملہ کر دیا۔ اسلامی لشکر کو شکست اٹھانی پڑی۔

ملک عزالدین اور دوسرے مخلص امراء آخری مرتبہ خلیفہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ کافر تاتاریوں کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ ہے اور وہ شہر کے دروازے پر آ

پہنچے ہیں۔ ہمارے پاس دفاع کی کوئی صورت نہیں۔ ایسے میں مصلحت وحکمت کا تقاضا یہ ہے کہ امیر المومنین دجلہ کے راستے کشتی میں بیٹھ کر چلے جائیں۔ خواتین اور اسباب بھی ہمراہ لے لیں۔ ہم آپ کے ساتھ رہیں گے۔ بصرہ کے قریب پہنچ کر کسی جزیرے میں قیام کریں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت میسر آئے اور ہم تاتاریوں کو مغلوب کرلیں۔

خلیفہ نے یہ تجویز بھی اپنے ''قابل اعتبار'' وزیر ابن علقمی کے سامنے رکھ دی۔ ابن علقمی نے کہا: ''میں نے تاتاریوں سے صلح کر لی ہے۔ کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر میری بات پر اعتماد نہ ہو تو امیر ابوبکر کو باہر ہلاکو کے پاس بھیج کر دیکھ لیں کہ وہ کس طرح شہزادے کی آؤ بھگت کرتا ہے۔'' دراصل یہ ابن علقمی کی چال تھی۔ ساتھ ہی اس نے خفیہ طور پر ہلاکو خان کو کہلا بھیجا کہ جب شہزادہ ابوبکر آپ کے پاس آئے تو اس کا زبردست استقبال کیا جائے۔

آگے کی کہانی ''طبقاتِ ناصری'' کے مصنف منہاج سراج کی زبانی سنئے: ''خلیفہ کا بیٹا امیر ابوبکر بغداد سے باہر آیا اور ہلاکو کی لشکر گاہ میں پہنچا تو تمام تاتاریوں اور ان کے ساتھ شامل (بعض غدار) مسلمانوں نے اس کا استقبال کیا اور مہمان داری کے تمام آداب بجالائے۔ جب شہزادہ ہلاکو خان کی بارگاہ میں پہنچا تو اس نے چالیس قدم آگے بڑھ کر پیشوائی کی۔ تواضع اور اکرام کا حق ادا کیا۔ بلکہ اپنی جگہ امیر ابوبکر کو بٹھایا اور ادب سے دوزانو ہو کر بیٹھا اور کہا: ''میں تو یہاں صرف خلیفہ کی خدمت میں باریاب ہونے کے لئے آیا ہوں۔ فرماں برداری کا حلف اٹھانا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے امراء سے پوچھا کہ روئے زمین پر اس وقت سب سے بڑا مسلمان کون ہے؟ تو انہوں نے امیر المومنین کا نام لیا۔ میری آرزو ہے کہ میں امیر المومنین کے ہاتھ پر اسلام قبول کروں۔''

ہلاکو خان نے ابن علقمی کے منصوبے کے عین مطابق شہزادہ ابوبکر سے اس طرح کی پرفریب باتیں کی اور ابوبکر کو اس کے خلوص کا یقین ہو گیا۔ وہ ابن علقمی کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس گیا۔ وہ خوش وخرم خلیفہ کے پاس آیا اور اپنے اکرام واستقبال کا حال سنایا۔ اب ابن علقمی نے ساتھ ہی لقمہ دیا کہ اب مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ خود خلیفہ پورے جلو کے ساتھ باہر جائیں' تاکہ ہلاکو خان ان کے استقبال کا شرف حاصل کرے۔ دربار کے امراء اور اکابر نے خلیفہ کو آخر وقت تک مشورہ دیا کہ وزیر کے کہنے پر بھروسہ نہ کیا جائے' لیکن خلیفہ نوشتۂ دیوار کو نہ دیکھ سکا۔

پھر جو کچھ ہوا' تاریخ کے صفحات میں ایک ایک بات درج ہے۔ بغداد کوئی چھوٹا موٹا شہر نہ تھا۔ چالیس روز تک اس کے وجود کو نوچا جاتا رہا۔ اصحاب علم وفن کو چن چن کر قتل کیا گیا' تاکہ اسلام کی فکری اور تمدنی بنیادوں کو مسمار کر دیا جائے۔ بغداد کا عظیم الشان کتب خانہ' جس میں لاکھوں کتابیں موجود تھیں' نذرِ آتش کر دیا گیا' یہاں تک کہ دجلہ کا پانی' جہاں یہ جلتی ہوئی کتابیں ڈالی گئی تھیں' ہفتوں تک سیاہ رنگ رہا۔ تاتاری لشکر نے قتل' عصمت دری' لوٹ مار' ظلم وستم اور مکانات ومحلات کی تباہی کے تمام سابقہ ریکارڈ مات کر دیئے۔ تاتاریوں کی یہ کوشش تھی کہ کوئی عمارت اور کوئی تہذیبی علامت باقی نہ رہے۔ اس سلسلے میں وہ آگ لگانے کے بہت شوقین تھے۔ عمارتوں سے اٹھتا دھواں دیکھ کر انہیں اتنا ہی نشہ ہوتا' جتنا شراب پی کر۔

فتح کے بعد گرفتار خلیفہ معتصم کو ہلاکو خان نے کھانے میں شریک ہونے کے لئے' خلیفہ کے شاہی محل میں اپنے سامنے دسترخوان پر بٹھایا' لیکن کھانے پینے کی کوئی چیز دینے کے بجائے خلیفہ صاحب کے سامنے سونے اور چاندی کے ڈھیر رکھ دیئے' جو اس کی فوج نے خلیفہ کے محلات سے لوٹے تھے اور کہا: ''جناب عالی! آپ نے جو کچھ جمع کر رکھا تھا۔ اب اسے تناول فرمایئے'' خلیفہ' اسلام نے کہا: ''میں سونا کس طرح کھا سکتا ہوں؟'' اس پر ہلاکو نے کہا۔ ''تو پھر آپ نے اسے اتنی حفاظت اور اہتمام سے کیوں رکھا ہوا تھا؟'' ہلاکو نے شاہی محل میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور سیم وزر اور جواہرات سے لبریز بڑے بڑے آہنی صندوقوں کی طرف تلوار سے اشارہ کرتے ہوئے گرفتار خلیفہ سے کہا: ''آپ نے ان صندوقوں کے فولاد سے اپنی فوج کے لئے تیروں کے سوفار کیوں نہ بنوائے اور یہ تمام سونا وجواہرات اپنے سپاہیوں میں تقسیم کیوں نہ کیا' اور آپ نے پہاڑوں کے دامن میں آگے بڑھ کر مجھے پہلے سے روکنے اور مقابلے کی کوشش کیوں نہ کی؟'' خلیفہ نے بے بسی کے عالم میں جواب دیا: ''مشیتِ ایزدی یہی تھی۔'' ہلاکو خان نے کہا: ''اچھا تو اب ہم جو سلوک آپ سے کرنے والے ہیں' اسے بھی مشیتِ الٰہی سمجھنا۔''

اس کے بعد ہلاکو خان نے جو سلوک خلیفہ معتصم باللہ اور شہر بغداد سے کیا' آج بھی محض خیال آنے سے لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ خلیفہ اور اس کے بیٹوں کو نمدے میں زندہ لپیٹ کر نمدے کو سی لیا گیا اور پھر خونخوار تاتاری سپاہیوں نے اس نمدے پر گھوڑے دوڑا دیئے۔ اس طرح خلیفہ اور اس کی اولاد کو گھوڑوں کے سموں کے نیچے مکمل طور پر روند ڈالا گیا۔ تلوار سے قتل کرنے کے بجائے نمدے میں لپیٹ کر گھوڑوں کے سموں تلے روند کر مارنے کی وجہ یہ تھی کہ بعض لوگوں نے ہلاکو سے کہا تھا کہ اگر زمین پر خلیفہ کا خون گرا تو یہ ہلاکو کی فتح کے لئے بدشگونی ہوگی اور مسلمان بھی اپنی تلوار واپس نیام میں نہیں رکھیں گے۔

علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی تصنیف ''تاریخ الخلفاء'' میں ہلاکو خان کا ایک خط نقل کیا ہے جو اس نے سقوط بغداد اوّل (فروری 1258ء) کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد شام کے حکمران سلطان ناصر کے نام لکھا تھا۔ یہ خط پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ سقوط بغداد دوم (اپریل 2003ء) سے فارغ ہو کر یہ خط جیسے امریکہ کے صدر بش نے شام' ایران اور پاکستان کے صدور کے نام لکھا ہے۔ خط کا مضمون یہ ہے:۔

''ملک الناصر! تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہم خدا کے لشکر ہیں۔ وہ ہمارے ہی ذریعے سے گناہ گاروں' خطا کاروں' ظالموں اور متکبروں سے انتقام لیتا ہے۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں' وہ خدا کے حکم سے کرتے ہیں۔ اگر ہم کو کبھی غصہ آ جاتا ہے تو کایا پلٹ دیتے ہیں۔ ہم نے بہت شہروں کو برباد کر دیا۔ بندگانِ خدا کو ہلاک کر دیا۔ ہم نے عورتوں اور بچوں پر بھی رحم نہیں کھایا۔ اس دنیا کے باقی ماندہ لوگو! تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہونے والا ہے۔ یاد رکھو' ہمارا لشکر رحم کھانے والا نہیں' بلکہ برباد کر دینے والا ہے۔ ہمارا مقصود ملک گیری نہیں' بلکہ انتقام ہے۔ ہماری تلوار سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ ہم سے بھاگ کر کہاں جاؤ گے۔ بحر وبر پر ہماری سلطنت ہے۔ ہماری ہیبت ودہشت سے دنیا کانپ اٹھی ہے۔ ہمارے قبضے میں تمام خلفاء وامراء ہیں۔ اب ہم تمہاری طرف بڑھ رہے ہیں۔ اب تم بھاگ سکتے ہو' تو بھاگو' ہم تمہارا پیچھے کر رہے ہیں۔''

انتقال پُرملال

رفیق تنظیم اسلامی لاہور شرقی محمد ارشد فاروقی کے چچا محمد ایوب شاہ 6 محرم کو اور ماموں خلیل الرحمٰن فاروقی 18 محرم کو قضائے الٰہی سے انتقال کر گئے۔ رفقاء واحباب سے مرحومین کے لئے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

یہی مقصودِ فطرت ہے' یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری' محبت کی فراوانی!
بتانِ رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تو رانی رہے باقی' نہ ایرانی' نہ افغانی
مٹایا قیصر وکسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدرؓ' فقرِ بوذرؓ' صدقِ سلمانیؓ!

حصّہ سوم

برطانوی تسلط سے پہلی خلیجی جنگ تک

فروری 1258ء میں خلافتِ عباسیہ کے خاتمے کے بعد عراق 1340ء تک منگولوں کے ایل خانی خاندان کے تسلط میں رہا' جس کا مرکز ایران میں تھا۔ 1340ء سے 1401ء تک ایک اور منگول خاندان جو جلائر کہلاتا ہے' عراق پر حکومت کرتا رہا۔ اس کے بعد دو ترک خاندانوں قرہ قویونلو (1410ء تا 1469ء) اور آق قویونلو (1469ء تا 1508ء) نے عراق پر حکومت کی' جن کے صدر مقام آذربائیجان اور اناطولیہ میں تھے۔ 1508ء سے 1534ء تک عراق' ایران کی صفوی سلطنت کا ایک صوبہ رہا۔ 1534ء سے 1918ء تک' تقریباً چار سو سال تک عراق خلافتِ عثمانیہ کا ایک صوبہ رہا۔

خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ

خلافتِ عثمانیہ کے آخری عشروں میں انتظامات کو بہتر بنانے کے خیال سے صوبہ عراق کو تین حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا' بصرہ' موصل اور بغداد۔ عراق میں اگرچہ یورپ کے تجارتی اور کاروباری موثرات اور سہولیات موجود تھیں' لیکن عراقیوں نے اُن سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا' بلکہ وہ بحیرۂ روم سے متصل عرب ملکوں سے زیادہ قریب رہے۔ عراق میں عیسائیوں کی تعداد بہت کم تھی' اور جتنی بھی تھی اس کا بیرونی عیسائی طاقتوں سے ربط ضبط نہ ہونے کے برابر تھا' البتہ یہاں کے یہودی بہت خوشحال تھے۔ وہ عموماً سیاست سے پہلوتہی کرتے تھے اور مقامی عراقیوں کے بجائے عثمانیوں کی مرکزی حکومت سے تعلق رکھنے کو ترجیح دیتے تھے۔ قبائلی شیوخ اور شیعہ حضرات اب بھی حزبِ اختلاف کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لئے سرکاری دفاتر اور تجارتی کمپنیوں میں ترک اور وسط ایشیائی باشندے براجمان تھے۔ گورنری' کمشنری اور افسر شاہی ترکوں کے ہاتھ میں تھی۔ عراق میں شرح خواندگی بہت کم تھی۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ قوم پرستی کی تحریک عراق میں آس پاس کے دوسرے عرب ملکوں کے بعد آئی۔ 1908ء میں قوم پرست نوجوان ترکوں نے ترکیہ میں ایک انقلابی تحریک شروع کر دی تھی اور ''انجمن اتحاد و ترقی'' کی بنیاد ڈال دی تھی۔ اس تحریک کے اثرات سب سے پہلے شام نے قبول کئے۔ عراق میں اب تک عثمانی حکومت کے خلاف کوئی عناد نہ تھا' البتہ عثمانی فوج کے چند عراقی فوجی افسروں نے خفیہ انقلابی سوسائٹی میں شمولیت اختیار کر رکھی تھی۔ یہ سوسائٹی عثمانی سلطنت کے عرب صوبوں کی آزادی اور خودمختاری کی حمایت کر رہی تھی۔

عراق اور خلیج فارس میں برطانیہ اٹھارہویں صدی کے اواخر ہی سے اپنے مفادات کو فروغ دینے کا خواب دیکھتا آ رہا تھا۔ بالآخر خلافتِ عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا سہرا بھی برطانیہ ہی نے اپنے سر بندھوایا۔ جنگِ عظیم اوّل کے پہلے کے چند برسوں کے دوران میں جرمنی اور نوجوان ترکوں میں رابطے بہت قریبی اور گہرے ہوتے جا رہے تھے جن سے برطانیہ کو تشویش لاحق ہوئی۔ جب جرمنی سے اناطولیہ اور وہاں سے بغداد تک ریلوے لائن بچھانے اور ریلوے لائن کے دونوں اطراف میں معدنیات دریافت و برآمد کے حقوق جرمنی کو دینے کا معاہدہ ہوا تو برطانیہ نے سخت احتجاج کیا۔ بغداد ریلوے کی تعمیر کے دوران میں خلیج فارس کے ایرانی علاقے میں اینگلو پرشین آئل کمپنی نے تیل نکالنا شروع کیا تو اندازے کئے جانے لگے کہ اس خطے میں دوسرے مقامات پر بھی تیل موجود ہو گا۔ 1912ء میں برطانیہ' جرمنی اور ہالینڈ کے چند تاجروں نے مل کر ''ٹرکش پٹرولیم کمپنی'' بنائی' جسے پہلی جنگِ عظیم چھڑنے سے ذرا پہلے موصل اور بغداد کی ولایات میں تیل دریافت کرنے کی اجازت دی گئی۔ جرمنی اور عراق کے روز افزوں تعلقات کے پیشِ نظر برطانیہ کو یہ خوف بھی ہونے لگا کہ کہیں عثمانی حکومت برطانیہ کے خلاف فوجی کارروائی نہ کر دے' برطانیہ نے خلیج فارس میں ہندوستان سے فوجی مہمات بھیجنے کا آغاز کر دیا۔ دریں اثناء نومبر 1914ء میں عثمانی حکومت نے پہلی جنگِ عظیم میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔

اب ذرا پیچھے ہٹ کر حالات پر پھر نظر ڈالئے۔ ہم نے کہا تھا کہ شام کے مقابلے میں عراق میں عرب قوم پرستی کا اثر کم تھا' لیکن عراقی باشندے عربوں کی قومی تحریک سے بے تعلق بھی نہیں تھے۔ عثمانی دور کے ممتاز عراقی شعراء معروف الرصافی اور جمیل الزہاوی نے ان میں معاشرتی اصلاح اور دستوری حکومت کی آرزو پیدا کی۔ نجف کے دینی مدرسوں نے جو شیعیت کے بڑے مرکز تھے' طلبہ کے اندر قوم پرستانہ جذبات پیدا کئے اور ان باتوں کی وجہ سے عراقی عوام میں بتدریج سلطنتِ عثمانیہ سے الگ ہونے کی راہ ہموار کی۔ مشروطی یا دستوری نظام قائم ہو جانے کے بعد علیحدگی کی اس تحریک نے اور زور پکڑا اور عثمانی فوج میں جو عراقی افسر تھے وہ ''العہد'' نامی خفیہ سوسائٹی میں شامل ہوئے' جو سلطنتِ عثمانیہ کے عرب علاقوں کو آزاد کرانے کے لئے استنبول میں قائم کی گئی تھی اور جس کی شاخیں بصرہ' موصل اور بغداد میں تھیں۔ 1916ء میں جب عثمانیہ حکومت کے خلاف عربوں کی بغاوت شروع ہوئی تو یہ عراقی فوجی افسر اس میں پیش پیش تھے۔ سعید نوری پاشا جو بعد میں عراق کے وزیرِاعظم ہوئے' عثمانی فوجوں کے اِن ہی عراقی افسروں میں سے ایک تھے۔

22 نومبر 1914ء کو انگریزی فوجوں نے بصرہ پر قبضہ کر لیا اور بغداد کی طرف پیش قدمی شروع کر دی لیکن 29 اپریل 1916ء کو ترک فوجوں نے انگریزوں کو کوت القمارہ کی جنگ میں شکست دے کر پسپائی پر مجبور کر دیا' لیکن اُسی سال کے اختتام تک انگریزوں نے دوسرا بڑا حملہ شروع کر دیا۔ 11 مارچ 1917ء کو بغداد پر قبضہ کر لیا' اور ڈیڑھ سال بعد جنگ کے آخری مرحلے پر 4 نومبر 1918ء کو موصل پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور اس طرح انگریز پورے عراق پر قابض ہو گئے۔

عربوں نے خلافتِ عثمانیہ کے خلاف انگریزوں کی مدد آزادی کی اُمید میں کی تھی' جس کا وعدہ حکومتِ برطانیہ نے اُن سے کیا تھا۔ چنانچہ مارچ 1920ء میں جب دمشق میں شریف حسین کے بیٹے فیصل کو شام کا بادشاہ بنایا گیا تو عراقی لیڈروں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شریف حسین کے دوسرے بیٹے عبداللہ کو عراق کا حکمران منتخب کر لیا' لیکن حکومتِ برطانیہ نے اس انتخاب کو تسلیم نہیں

کیا اور عربوں سے وعدہ خلافی کر کے' بلکہ دھوکا دے کر عراق کو براہِ راست اپنے انتظام میں لے لیا۔ برطانیہ کی اس وعدہ خلافی اور دھوکا دہی پر جون 1920ء میں عراق میں بغاوت ہوگئی' جس میں قبائلی باشندوں نے نمایاں حصہ لیا۔ بغاوت کئی ماہ جاری رہی اور اس میں چار ہزار عرب شہید ہوئے۔ اگرچہ انگریزوں نے عسکری طاقت کے بل پر بغاوت کچل دی لیکن عربوں کی بے چینی میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔

عربوں کی سیاسی تحریک کے نتیجے میں آخر کار حکومتِ برطانیہ 23 اگست 1921ء کو شاہ فیصل کو عراق کا حکمران مقرر کرنے اور عراق کی ''قومی مجلس'' قائم کرنے پر مجبور ہو گئی' لیکن فیصل کی یہ بادشاہت صرف نام کی تھی' عراق کا حقیقی سربراہ اب بھی برطانوی ہائی کمشنر تھا۔ چنانچہ ملک میں مکمل آزادی حاصل کرنے کے لئے تحریکیں چلتی رہیں' جن کے دباؤ کے تحت انگریز اپنے اختیارات بتدریج عراقی حکومت کو منتقل کرتے رہے' اور 23 اکتوبر 1932ء کو انہوں نے اپنے چند مفادات (تیل کی صنعت میں) کے تحفظ کے ساتھ عراق کی مکمل آزادی تسلیم کر لی۔ آزادی کے ساتھ ہی عراق لیگ آف نیشنز کا رکن بن گیا جو دنیا میں امن قائم رکھنے کی غرض سے پہلی جنگِ عظیم کے بعد 10 جنوری 1920ء کو قائم کی گئی تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کو روکنے میں ناکامی کے بعد 24 اکتوبر 1945ء کو ''اقوام متحدہ'' کے نام سے نئی بین الاقوامی تنظیم قائم کی گئی اور لیگ آف نیشنز کو 10 جنوری 1946ء کو توڑ دیا گیا۔ لیگ آف نیشنز کا دفتر جنیوا (سوئٹزرلینڈ) میں تھا' جبکہ اقوام متحدہ کا دفتر نیویارک میں ہے (''اقوام متحدہ'' بھی مارچ 2003ء میں عراق کے خلاف یک طرفہ امریکی و برطانوی جارحیت کو روکنے میں ناکام رہی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ عالمی ادارہ کب ٹوٹے گا)

آزادی کے بعد

عراق کے پہلے حکمران شاہ فیصل (1921ء تا 1933ء) شریف حسین کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ انہوں نے تحریک آزادی میں بڑے تدبّر سے حصہ لیا تھا۔ انہوں نے ایک طرف حکومتِ برطانیہ سے خفیہ مراسلت جاری رکھی اور دوسری طرف وہ ترکوں کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتے رہے۔ انہوں نے عثمانی حکومت کی امداد کے نام پر جو رضا کار دستے منظم کئے تھے' وہ بغاوت شروع ہونے پر انگریزوں سے مل گئے اور ایک ایسے نازک موقع پر جب انگریز مصر کی طرف سے فلسطین پر حملہ آور ہوئے' ان دستوں نے ترکوں کی پشت پر خنجر گھونپ دیا' جس کی وجہ سے ترک فوجوں کو انگریزوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے عرب باغیوں کا مقابلہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا اور ترکوں کے لئے شام و فلسطین کو چھوڑ دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں رہا۔

8 ستمبر 1933ء کو شاہ فیصل کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے شاہ غازی (1933ء تا 1939ء) تخت نشین ہوئے اور جب وہ عین عالمِ جوانی میں ایک حادثے میں ہلاک ہو گئے تو اُن کے نابالغ بیٹے شاہ فیصل ثانی (1939ء تا 1958ء) کو بادشاہ بنایا گیا۔ فیصل ثانی کی عمر اُس وقت صرف چار سال تھی اس لئے اُن کی کم سنی کے زمانے میں اُن کے چچا عبداللہ نے سرپرست کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔

شاہ فیصل اور عبداللہ کے بعد عراق کے بادشاہی دور کی سب سے اہم سیاسی شخصیت نوری سعید پاشا کی تھی۔ وہ بغداد میں 1888ء میں پیدا ہوئے اور خلافتِ عثمانیہ کے زمانے میں ترک فوج میں ایک افسر تھے' لیکن انہوں نے قوم پرست عربوں سے خفیہ تعلقات قائم کر لئے۔ عربوں کی بغاوت شروع ہونے پر انگریزوں نے اُن کو حجاز کے محاذ پر بھیجا' جہاں نوری سعید نے امیر فیصل کی فوج میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ جنگِ عظیم کے خاتمے پر انہوں نے عراق کی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ وہ آزاد عراق کے پہلے کمانڈر انچیف مقرر ہوئے اور 1930ء اور 1958ء کے درمیان چودہ مرتبہ عراق کے وزیراعظم رہے۔ عراق کو ترکی اور ایران سے قریب لانے میں اُن کا اہم حصہ ہے۔ وہ کمیونزم کے سخت مخالف تھے اور جمہوریت کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ عراق کے مردِ آہن تھے۔ اپنے مخالفین کو سختی سے دبایا۔ اُن کے زمانے میں اخبارات کا گلا گھونٹا گیا اور سیاسی زندگی معطل رہی۔ 1954ء میں انہوں نے سیاسی جماعتوں کو بھی ختم کر دیا۔ وہ بڑے برطانیہ نواز تھے اور اُن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ انگریزوں سے بھی زیادہ انگریزی مفادات کی ترجمانی کرتے تھے۔ انہی کی کوششوں سے فروری 1955ء میں عراق' ترکی' ایران' پاکستان اور برطانیہ پر مشتمل ''بغداد پیکٹ'' ہوا تھا۔

نوری السعید کی استبدادی حکومت نے عوام کو شاہی خاندان اور نوری سعید کے خلاف کر دیا اور نوری سعید کی وزارت کو معطل کرنے کا عوامی مطالبہ زور پکڑ گیا' اور جب جمہوری طریقے سے تبدیلی لانا ناممکن ہو گیا تو عراقی فوج کے ایک افسر جنرل عبدالکریم قاسم نے 14 جولائی 1958ء کو (پاکستان کے ایوب خانی مارشل لاء سے تین ماہ قبل) حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔ نوری السعید کے ساتھ شاہ فیصل ثانی اور شاہی خاندان کے تمام افراد جن میں خواتین بھی شامل تھیں' وحشیانہ طریقے پر قتل کر دیئے گئے اور اُن کی لاشوں کی بے حرمتی کی گئی۔

1963ء۔ کرنل عبدالسلام عارف نے' جو قاسم کا ایک حلیف تھا' فوجی بغاوت کر کے اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیا اور عبدالکریم قاسم کو پھانسی دے دی۔

1964ء۔ عراقی فوج اور کرد قبائل کی جنگ رُک جاتی ہے' سیز فائر ہو جاتا ہے' لیکن چند ماہ کے بعد دوبارہ جنگ شروع ہو جاتی ہے۔

1966ء۔ عبدالسلام عارف ایک ہیلی کاپٹر کے حادثے میں ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اُن کی جگہ اُن کے بھائی عبدالرحمٰن عارف عہدۂ صدارت سنبھالتے ہیں۔

1967ء۔ اسرائیل سے چھ روزہ جنگ میں عربوں کی شکست کے بعد جنرل عبدالرحمٰن عارف نئی وزارت

کشور ناہید

خود ساختہ خدا

تم آسماں میں کسی عدالتی تحقیقات کے بغیر
مجرم قرار دیئے جا چکے ہو
تمہارے جرم کے نقوش
سعودی ریت نے بھی سنبھال رکھے ہوئے ہیں
تمہارے جرم ان آنکھوں میں بھی لکھے ہیں
جو بموں کے زخموں سے پتھرا گئی ہیں
تم غارِ حرا کا سامنا کیسے کرو گے
کہ تم تو جھوٹ کے غاروں میں بیٹھے
سی این این اور امن مشن
بناتے رہے ہو
ہماری تاریخ تو پانی نہ ملنے کی آب دار داستان ہے
تم نے تو آبِ زم زم کو بھی داغ دار کر دیا ہے
تم نے اس خاک کو بھی
جس کا چپہ چپہ سجدہ گاہِ جہاں کہلاتا ہے
فرنگیوں کی توپوں اور بارودی سرنگوں سے آلودہ کر دیا ہے
صفا اور مروہ کی سرزمین!
تیل اور ڈالر کے خود ساختہ خداؤں کو بتا دے
کہ تیرے بدّو بیٹے
نجف و کربلا کی گلیوں میں رہنے والوں کے
دودھ شریک بھائی ہیں
ان کی مٹھیوں کو کم قیمت ڈالروں سے مت آزماؤ
جاؤ اور سمجھاؤ
کہ تم اوپر آسمان میں
کس عدالتی تحقیقات کے بغیر
مجرم قرار دیئے جا چکے ہو

بناتے ہیں' جس کے سربراہ لیفٹیننٹ جنرل طاہر یحییٰ تھے۔

1968ء۔ فوج کے اعلیٰ افسروں نے بعث پارٹی سے مل کر اقتدار پر قبضے کا فیصلہ کیا۔ 17 جولائی کو احمد حسن البکر کی سرکردگی میں فوجی افسروں نے پُرامن فوجی انقلاب برپا کر کے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی۔ انقلابی کمانڈ کونسل قائم کی گئی جس کے ایک رُکن کرنل عبدالرزاق النائف نے عہدوں کی تقسیم پر اعتراض کیا تو افسروں کے گروپ لیڈر صدام حسین نے اُسے گرفتار کر کے فوج سے الگ کر دیا۔

1969ء۔ چالیس عراقیوں کو جن میں سے بیشتر یہودی تھے' پھانسی دے دی جاتی ہے' اُن پر اسرائیل اور امریکہ کے لئے جاسوسی کا الزام تھا۔

1971ء۔ عراق فلسطینی مجاہدین کی حمایت میں اردن کی سرحدیں بند کر دیتا ہے۔ عراق میں امریکی سفارت خانے کی املاک پر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔

1973ء۔ عراق کے ڈائریکٹر جنرل سیکورٹی کرنل ناظم قزّار نے نیا فوجی انقلاب لانے کی کوشش کی' جسے کچل دیا جاتا ہے اور کرنل ناظم اور اُس کے 35 ساتھیوں کو پھانسی دے دی جاتی ہے۔ جولائی میں بعث پارٹی اور عراقی کمیونسٹ پارٹی کے تعاون سے قومی ترقی پسند محاذ بنایا گیا۔ ملک کی تیسری سیاسی پارٹی کردستان ڈیموکریٹک لیگ ہے۔

1974ء۔ کرد قبائل عراق کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیتے ہیں۔

1975ء۔ اس سال میں دو بڑے معاہدے ہوئے۔ کرد قبائل سے صلح کا معاہدہ ہوتا ہے اور ایران سے شط العرب کے بارے میں معاہدہ ہوتا ہے۔ ان دونوں معاہدوں کا پس منظر بیان کرنا ضروری ہے۔

کردستان: عراق کے اندرونی مسائل میں سب سے اہم مسئلہ کردوں کا ہے۔ عراق کی بیس فیصد آبادی کرد قبائل پر مشتمل ہے۔ شمال مغرب کا خوبصورت پہاڑی علاقہ' جس میں سلیمانیہ' اربیل اور دہوک کے شہر واقع ہیں' کردوں کے ہیں۔ کردوں کا علاقہ ایسا عجیب ہے کہ مشرق میں اُس کی سرحدیں ایران سے' جنوب میں عراق سے اور مغرب میں ترکی سے ملتی ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے عراقی کرد قبائل بالخصوص اس علاقے کی آزادی اور خودمختاری کے لئے اور آزاد کردستان کے قیام کے لئے جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ 1958ء میں بادشاہت کا خاتمہ ہونے کے بعد انہوں نے کئی بار بغاوتیں بھی کیں۔ ان بغاوتوں میں پس پردہ ایران اور ترکی کے علاوہ روس کا ہاتھ بھی رہا ہے۔ بعث پارٹی کی حکومت نے تدبر سے کام لیتے ہوئے مارچ 1970ء میں کردوں سے تصفیہ کر لیا کہ مارچ 1974ء تک اُن کو اندرونی خودمختاری دے دی جائے گی۔ جب حسبِ معاہدہ مارچ 1974ء میں اندرونی خودمختاری دے دی گئی تو بعض کرد قبائل نے یہ منصوبہ اس لئے مسترد کر دیا کہ خودمختار کردستان میں کرکوک کو شامل نہیں کیا گیا۔ چنانچہ 1974ء اور 1975ء کے دوران میں اس گروہ سے' جس کی رہنمائی مصطفیٰ برزانی کر رہے تھے' عراقی حکومت کی لڑائیاں جاری ہیں۔ لیکن 1975ء میں جب ایران اور عراق میں معاہدہ ہو گیا اور مصطفیٰ برزانی ایران فرار ہو گئے تو باقی کردوں نے بھی جنگ ختم کر دی اور عراقی حکومت نے ان سب کردوں کو معافی دے دی۔ عراقی کردستان کا صدر مقام اربیل ہے۔ عراقی حکومت نے کردی زبان کو بھی سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا اور کردستان میں عربی کے ساتھ کردی زبان بھی استعمال ہوتی ہے۔

شط العرب: پڑوسی ملکوں میں کویت اور ایران سے عراق کے تعلقات شروع ہی سے خراب رہے ہیں۔ کویت پر عراق اپنا حق سمجھتا تھا' اس لئے جب کویت نے برطانیہ سے آزادی حاصل کی تو عراق نے کویت کی آزاد حیثیت کو تسلیم نہیں کیا' لیکن عبدالسلام عارف کی حکومت نے کویت کی آزادی کو تسلیم کر کے یہ تنازعہ ختم کر دیا۔ 1969ء میں شط العرب کے مسئلے پر ایران سے تنازعہ شروع ہو گیا۔ دریائے دجلہ اور فرات جہاں ایک دوسرے سے ملتے ہیں' تو یہ مشترکہ دھارا شط العرب کہلاتا ہے۔ سمندر میں گرنے سے پہلے یہ شط العرب ایران اور عراق کی حد بندی کرتا ہے۔ اس طرح شط العرب دونوں ملکوں کی جہاز رانی کے لئے مشترکہ حیثیت رکھتا ہے۔ شط العرب پر ایران کا دعویٰ دونوں ملکوں کے لئے تنازعہ کا باعث بن گیا۔ یہ تنازعہ اتنا بڑھا کہ 1971ء میں دونوں ملکوں نے سفارتی تعلقات بھی ختم کر دیئے۔ کردستان کا مسئلہ طے ہو جانے کے بعد دونوں ایک دوسرے سے قریب آنا شروع ہوئے اور اکتوبر 1973ء میں جنگِ فلسطین ختم ہونے کے بعد سفارتی تعلقات بحال ہو گئے۔ مارچ 1975ء میں دونوں ملکوں نے شط العرب کے مسئلے پر معاہدہ کر لیا۔

1977ء۔ صدر حسن البکر اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لئے انقلابی کمانڈ کونسل کے ارکان کی تعداد 5 سے بڑھا کر 22 کر دیتے ہیں۔

1979ء۔ صدر حسن البکر پورے گیارہ سال اقتدار میں رہنے کے بعد 16 جولائی 1979ء کو صدارت سے مستعفی ہوتے ہیں۔ اُسی دن اُن کے نائب جنرل صدام حسین اُن کی جگہ انقلابی کمانڈ کونسل کے صدر' عراق کے وزیراعظم' کمانڈر انچیف اور بعث پارٹی کے سیکریٹری جنرل ہو گئے۔ عراق میں خود بعث پارٹی کے مختلف گروپ آپس میں لڑتے رہتے ہیں۔ ایک مضبوط گروپ اُن لوگوں پر مشتمل ہے جو شام کی بعث پارٹی سے قریب تر ہے اور جس میں شیعہ عناصر کو غلبہ حاصل ہے۔ 8/اگست 1979ء کو صدام حسین کی حکومت ایسے اکیس (21) لوگوں کو پھانسی دیتی ہے۔ ان میں انقلابی کمانڈ کونسل کے پانچ ارکان بھی شامل تھے۔ ان کے علاوہ 33 افراد کو ایک سال سے پندرہ سال تک کی سزائے قید دی گئی۔ ان لوگوں پر شام کے صدر حافظ الاسد سے سازش کرنے کا الزام تھا۔

1980ء۔ جب 1979ء میں شاہِ ایران کا تخت اُلٹ دیا گیا تو عراق نے اس سمجھوتے کو پس پشت ڈالتے ہوئے مطالبہ کیا کہ شط العرب کے مشرقی کنارے کو عراق ایران کی سرحد تسلیم کیا جائے۔ ایران نے یہ مطالبہ تسلیم نہیں کیا۔ تنازعہ بڑھتا گیا اور ستمبر 1980ء میں عراق نے ایران پر بھرپور حملہ کر دیا۔ عراقی فوج صوبہ خوزستان میں دُور تک گھستی چلی جاتی ہے۔ عراق کی فضائیہ ایران کے مشہور شہر آبادان کے تیل کے کارخانوں پر بمباری کرتی ہے۔ جوابی کارروائی کے طور پر ایران بغداد' موصل اور بصرہ کے کارخانوں پر بمباری کرتا ہے۔ جنگ زوروں پر ہے۔

1981ء۔ برادر اسلامی ممالک' جن میں پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاء الحق پیش پیش ہیں' عراق اور ایران میں صلح صفائی کرانے کی کوشش کرتے ہیں جو صدر صدام حسین کو منظور نہیں۔ خوزستان میں جنگ جاری ہے۔ اسرائیل کے لڑاکا طیارے بغداد کے قریب فرانس کے تعاون سے بنائے گئے ایٹمی ریکٹر کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

1982ء۔ ایران کے جارحانہ حملے عراق کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ عراق خرم شہر اور بندرگاہ خالی کر دیتا ہے۔ ایرانی فوج عراق کی سرزمین میں داخل ہو جاتی ہے اور بصرہ کے قریب تک جا پہنچتی ہے۔

1988ء۔ عراق ایران جنگ کی آگ مسلسل آٹھ سال تک بھڑکتی رہی۔ فضائی اور زمینی حملوں سے دونوں ملکوں کے پُررونق شہر اور قصبے کھنڈروں میں تبدیل ہو گئے۔ خلیج فارس میں بین الاقوامی جہاز رانی ناممکن ہو گئی۔ بالآخر اقوام متحدہ کی کوششوں سے یہ جنگ اگست 1988ء میں بند ہوئی۔ دونوں پڑوسی اسلامی ملکوں کی معیشت تباہ ہو گئی۔ اس طویل جنگ میں فریقین کے دس لاکھ مسلمان شہید ہوئے' تقریباً 20 لاکھ زخمی ہو کر ہمیشہ کے لئے معذور ہو گئے۔

پہلی خلیجی جنگ

4 ستمبر 1990ء کو عراق کے وزیر خارجہ طارق عزیز نے عرب ممالک اور دوسرے متعلقہ ملکوں کو ایک طویل خط لکھا تھا' جس کے آغاز میں انہوں نے تنازعے کا تاریخی

پس منظر بیان کیا تھا۔ اس خط کا خلاصہ یہ ہے: ''کویت کے لفظی معنی ہیں ''چھوٹی سی بستی''۔ پہلی جنگ عظیم سے بیشتر یہ چھوٹی سی بستی عراق کی مملوکہ تھی اور عثمانی حکومت کے تحت صوبہ بصرہ میں شامل تھی۔ 1897ء میں ترک سلطان نے کویت کے ایک شیخ مبارک الصباح کو اس چھوٹی سی بستی کا قائم مقام منتظم مقرر کیا۔ 1899ء میں شیخ مبارک صباح نے کسی قانونی جواز و اختیار کے بغیر انگریزوں سے ایک خفیہ فوجی معاہدہ کر لیا۔ ترک سلطان نے یہ معاہدہ منسوخ کر دیا اور شیخ صباح کو معذرت کر کے سلطان ترکی سے اپنی وفاداری کا اعلان کرنا پڑا۔ یہ 1901ء کی بات ہے۔

لیکن برطانیہ اپنی سازشی عادت سے باز نہ آیا اور علاقے میں اپنی اقتصادی اور فوجی ساکھ جمانے کے لئے سازشیں کرتا رہا۔ چنانچہ فرانس سے ایک معاہدہ کے تحت کویت کو عراق کے جغرافیے سے نکال کر اپنے انتداب میں لے لیا۔ عراق اپنی موجودہ جغرافیائی سرحدوں کے ساتھ 1921ء میں وجود میں آیا تھا۔ ابتدا ہی سے اُس نے کویت کو واپس لینے کا مطالبہ جاری رکھا' لیکن برطانیہ نے اس پر اپنا قبضہ جمائے رکھا ..... 1945,1940,1932ء میں عراق نے بار بار برطانیہ اور کویت کو یاد دہانی کرائی..... دوسری جنگ عظیم کے بعد خطے میں پے در پے متعدد تبدیلیاں آئیں۔ اسرائیل قائم ہوا' عرب اسرائیل جنگیں ہوئیں' مصر میں شاہ فاروق کا تختہ الٹا گیا..... 1956ء میں جب عرب یونین قائم ہوئی تو عراق نے ایک مرتبہ پھر یہ مسئلہ اٹھایا اور برطانیہ سے کہا کہ وہ کویت کو عرب یونین میں شامل ہونے دے۔ برطانیہ نے کہا کہ وہ کویت کو آزادی دے رہا ہے۔ کویت آزاد ہونے کے بعد خود فیصلہ کرے گا کہ وہ عرب یونین میں شامل ہو یا نہ ہو..... چنانچہ اپریل 1957ء میں عراق نے کویت کے امیر شیخ عبداللہ السلیم الصباح سے عرب یونین میں کویت کے انضمام کے بارے میں گفتگو کی۔ کوشش ناکام رہی..... 1958ء میں عراق کے وزیراعظم نوری السعید نے ''معاہدۂ بغداد'' کے ارکان (ترکی اور پاکستان) کو بتایا کہ عراق اور کویت کی وحدت کی کیا اقتصادی و فوجی اہمیت ہے' لیکن برطانیہ نے آگے بڑھ کر اس کوشش کو بھی خاک میں ملا دیا..... بالآخر برطانیہ اس مسئلے پر گفتگو کے لئے تیار ہو گیا۔ طے پایا کہ 24 جولائی 1958ء کو لندن میں میٹنگ ہو گی' لیکن دس روز پہلے 14 جولائی کو بغداد میں فوجی انقلاب برپا ہو گیا اور یوں میٹنگ منسوخ ہوئی..... 1961ء میں برطانیہ نے کویت کو آزادی عطا کر دی۔ 19 جون کو برطانیہ اور کویت کے درمیان خصوصی تعلقات کا معاہدہ طے پایا۔ 25 جون کو حکومت عراق نے اعلان کیا کہ کویت عراق کا اٹوٹ انگ ہے۔ اس اعلان کا جواب برطانیہ نے یوں دیا کہ اُس نے کویت کی حفاظت کے لئے فوجی دستے بھیج دیئے..... 21 جولائی 1961ء کو عرب لیگ نے کویت کو اپنا رُکن بنانے کا فیصلہ کیا تو عراق نے یہ فیصلہ ماننے سے انکار کر دیا اور اپنے سابقہ موقف کا اعادہ کیا۔ ستر اور اسّی کی دہائیوں میں عراق کویت کے شیوخ پر برابر دباؤ ڈالتا رہا کہ وہ مسئلے کا کوئی حل نکالیں' لیکن شیوخ آزاد خیال تھے نہ آزاد رائے' بلکہ وہ اپنے غیر ملکی آقاؤں کے دباؤ میں تھے' اس لئے وہ سامراجی منصوبوں کی گرفت سے نکلنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔''

تاریخی پس منظر تفصیل سے بتانے کے بعد عراق کے وزیر خارجہ طارق عزیز نے اپنے مراسلے میں صدر صدام حسین کی اُس تقریر کے چند حوالے دیئے جو انہوں نے اردن میں منعقدہ عرب سربراہ کانفرنس میں فروری 1990ء میں کی تھی۔ صدر صدام نے اُس تقریر میں کہا تھا: ''خلیجی علاقے میں امریکا کی مسلسل موجودگی اب مستقل صورت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ بین الاقوامی حالات میں چند معنی خیز تبدیلیاں آئی ہیں' اس لئے کہ امریکا' یورپ' جاپان اور غالباً روس کی بھی تیل کی ضروریات بڑھتی جا رہی ہیں۔ سو اب امریکا نے خلیج اور اُس کے تیل پیدا کرنے والے خطے میں ایک سپر پاور کی حیثیت سے ناقابل چیلنج برتری قائم رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ایسی صورت حال پیدا ہونے والی ہے کہ امریکا ہی یہ طے کرے گا کہ کس ملک کو کتنا تیل اور کتنی گیس پیدا کرنی چاہئے اور یہ کہ کس ملک کو کتنا' کب اور کس قیمت پر فروخت کیا جائے' اور یہ فیصلے کرتے وقت صرف اور صرف امریکا کے مفادات کا لحاظ رکھا جائے گا اور عرب ملکوں کے مفادات کو ملحوظ نہیں رکھا جائے گا۔

صدر صدام حسین نے یہ تقریر فروری 1990ء میں اردن میں عرب سربراہ کانفرنس میں کی تھی۔ اس کے بعد امریکا نے عراق کے خلاف ایک ہیجانی تحریک شروع کر دی۔ تیز رفتار ذرائع ابلاغ اور نشریاتی پروگراموں کے ذریعے فوجی کارروائی کے لئے زمین ہموار کی گئی تاکہ عراق کی عسکری طاقت کو تباہ کر دیا جائے' تاکہ خطے میں طاقت کا توازن اسرائیل کے حق میں ہو جائے۔

فروری 1990ء میں تیل کی قیمت 18 تا 21 ڈالر فی بیرل تھی' لیکن کویت اور امارات اور شیوخ نے مل کر عراق کی معیشت کو تباہ کرنے کے ارادے سے تیل کی قیمت گھٹا کر گیارہ ڈالر کر دی' جبکہ اُنہیں معلوم تھا کہ عراق ایران کی طویل جنگ کے باعث عراق کی اقتصادی حالت پہلے ہی انتہائی خستہ حال تھی اور تیل کی قیمت اس حد تک گھٹانے سے عراق کے سالانہ بجٹ میں مزید کئی ارب ڈالر کا خسارہ ہو جائے گا۔

طارق عزیز نے اپنے خط کے آخر میں لکھا: ''یہ عراق کے خلاف کھلی معاشی جارحیت تھی جو فوجی جارحیت سے بھی زیادہ شدید ہے۔ صدر صدام نے یہ تجویز پیش کی کہ تمام متنازعہ اُمور اقوام متحدہ کے بنائے ہوئے ایک جیسے اصولوں اور ایک کسوٹی پر حل کئے جائیں۔ امریکا برطانیہ نے اس تجویز کو فوراً ہی مسترد کر دیا۔ چاہئے تھا کہ وہ اس تجویز کی تفصیلات طلب کرتے' متن کی نقل منگوائے' اپنے اس عمل سے امریکا نے اپنے دوہرے معیار کی توثیق کر دی کہ علاقائی اور بین الاقوامی مسائل کو وہ ایک عینک سے دیکھتا ہے اور اپنے اور اسرائیل کے مفادات کو وہ دوسری نظر سے دیکھتا ہے''۔

چنانچہ ''تنگ آمد' بجنگ آمد'' کے مصداق 2/اگست 1990ء کو عراقی فوج حملہ آور ہو کر کویت میں داخل ہو گئی اور ملک پر قبضہ کر لیا۔ امیر کویت اور اُس کا خاندان سعودی عرب پرواز کر گیا۔ اقوام متحدہ کے ہنگامی اجلاس میں عراقی جارحیت کی مذمت کی گئی اور مطالبہ کیا گیا کہ عراقی فوجیں کویت سے غیر مشروط طور پر نکل جائیں۔

3/اگست۔ عراق کی سعودی عرب کی جانب پیش قدمی۔ صدر بش نے عراق کو متنبہ کیا کہ وہ اپنی افواج کو روک لیں۔ امریکی وزیر خارجہ جیمز بیکر اور روسی وزیر خارجہ شیورڈنا ڈزے نے ایک مشترکہ بیان میں عراقی جارحیت کی مذمت کی۔

6/اگست۔ عراقی فوجیوں نے کویت میں موجود امریکی اور برطانوی شہریوں کو اپنے محاصرے میں لے لیا۔ شاہ فہد نے دوست ممالک سے سعودی عرب کے دفاع میں مدد طلب کی۔ چنانچہ صدر بش نے

حبیب جالب

سرمہ نہ لگاؤ مولانا

عزت سے جینا ہے اگر تو بجٹ گھٹاؤ مولانا
امریکہ کی چوکھٹ پر سر کو نہ جھکاؤ مولانا
کہا ہمیشہ جنگ' تباہی' آنسو' آہیں دیتی ہے
کہنا' ہمیشہ جنگ سے اپنی جان بچاؤ مولانا
آپ کی جانب داری تو لکھی ہے آپ کے چہرے پر
آپ کرانے نکلے ہیں' کیا بیچ بچاؤ مولانا
عالی شان مکان' پجارو' ٹھاٹ باٹ' نوکر چاکر
کیسے ملتے ہیں؟ ہم کو گر سکھلاؤ' مولانا
اپنے رُخ پر درد سجا لو اب تو بے بس لوگوں کے
جب تک جنگ خلیج میں ہے' سرمہ نہ لگاؤ مولانا

ایف 15 لڑاکا طیاروں کا اسکواڈرن اور پوری 82 ڈویژن سعودی عرب روانہ کر دیئے۔

22/اگست۔ یورپی برادری کے وزرائے خارجہ نے عراق کی مقرر کردہ 24 اگست کی ڈیڈ لائن کو مسترد کر دیا جس کے مطابق تمام مغربی سفارت کاروں کو کویت سے نکل جانا تھا۔

25/اگست۔ خلیج کے تنازعے پر کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے امریکی صدر بش اور روسی صدر گورباچوف نے مذاکرات کئے جس میں صدر صدام حسین کو متنبہ کیا گیا کہ وہ فوری طور پر کویت سے نکل جائیں ورنہ اس کے خلاف سخت فوجی کارروائی کی جائے گی۔ ایران اور عراق کی جنگ کے بعد دونوں ملکوں میں جو کشیدگی پائی جاتی تھی اُس کو دور کرنے کے لئے ایران اور عراق نے سفارتی تعلقات دوبارہ بحال کرنے کا فیصلہ کیا۔

26/ستمبر۔ پینٹاگون نے اعلان کیا کہ امریکا مزید پچاس ہزار سے ایک لاکھ تک فوجی دستے اور 500 جنگی ٹینک سعودی عرب روانہ کر رہا ہے۔

7/نومبر۔ صدام حسین نے بری فوج کے چیف آف سٹاف کو برطرف کر کے اُن کی جگہ لیفٹیننٹ جنرل حسین راشد کو مقرر کیا۔

29/نومبر۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے ایک قرارداد 678 منظور کی جس میں عراق کو دھمکی دی گئی کہ اگر اُس نے 15 جنوری تک اپنی افواج کویت سے نہ نکالیں تو اقوام متحدہ اُس کے خلاف سخت کارروائی کرے گا۔ یمن اور کیوبا نے اس قرارداد کے خلاف ووٹ دیا۔

30/نومبر۔ عراق نے اقوام متحدہ کی قرارداد کو غیر قانونی قرار دیا۔ سلامتی کونسل کے پانچ مستقل رکن ممالک کے وزراء خارجہ نے کہا کہ اگر عراق کویت کو خالی کر دے گا تو اس پر حملہ نہیں ہوگا۔

23/دسمبر۔ امریکا کے وزیر دفاع ڈک چینی نے متنبہ کیا کہ امریکا کے پاس کیمیائی ہتھیاروں سمیت ہر قسم کا جدید جنگی اسلحہ ہے جو وہ عراق کے خلاف استعمال کرے گا۔

15/جنوری۔ پانچ لاکھ امریکی فوجیوں کی کویت کی جانب پیش قدمی۔

16/جنوری۔ ڈیڈ لائن ختم ہوگئی۔ جنگ کا آغاز: امریکی فوج نے عراقی مواصلاتی نظام جام کر دیا۔ فضائی حملے شروع۔ اسرائیلی شہروں پر اسکڈ میزائلوں سے عراقی حملے۔ عراق پر دو ہزار امریکی فضائی حملے روزانہ کئے جا رہے ہیں۔

18/جنوری۔ امریکی جنرل ''آپریشن ڈیزرٹ سٹورم'' کے تحت عراق پر حملہ کرتا ہے۔

28/فروری۔ جنگ بند ہوگئی۔ عراقی فوج کو شکست ہوگئی۔ کویت آزاد ہوگیا۔ صدر بش نے متنبہ کیا کہ عراق نے شرائط کی خلاف ورزی کی تو دوبارہ جنگ شروع ہو جائے گی۔

2/مارچ۔ سلامتی کونسل کے مستقل ارکان جنگ بندی کی قرارداد پر متفق ہوگئے۔

3/مارچ۔ عراق نے اقوام متحدہ کی تمام قراردادیں غیر مشروط طور پر تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔

خلیجی جنگ میں عبرت ناک شکست اور کردوں اور شیعوں کی بغاوت کے باوجود صدر صدام حسین کے اقتدار پر فرق نہیں پڑا۔ اس جنگ کے دوران میں دنیا بھر کی ہر زبان میں جنگ' اس کے مقاصد' اسباب ونتائج پر تبصرے اور جائزے شائع ہوئے۔ اُردو میں بھی اتنا مواد شائع ہوا کہ اُن کو جمع کیا جائے تو کئی کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ ہم یہاں قارئین کے لئے صرف دو مضامین پیش کر رہے ہیں: ایک صدام حسین کی اُس تقریر کا اُردو ترجمہ (براستہ انگریزی) ہے جو انہوں نے جنگ کے اوائل میں کی تھی۔ اس تقریر میں انہوں نے بڑی وضاحت سے اپنا موقف اور منشور پیش کیا ہے۔ دوسرا مضمون مولانا خلیل احمد الحامدی مرحوم کا انتہائی فاضلانہ' مدلل اور حقائق پر مبنی بے لاگ جائزہ ہے جس میں چشم دید حالات کا بیان بھی ہے' صدام حسین اور شاہ فہد سے ذاتی ملاقاتوں کا تذکرہ بھی ہے' عرب معاشرے کا تجزیہ بھی ہے۔ یہ دونوں مضامین جہاں پہلی خلیجی جنگ کے حقائق کی پردہ کشائی کرتے ہیں' وہاں اس جنگ کے بعد دوسری خلیجی جنگ تک بارہ سال تک مسلسل امریکی ریشہ دوانیوں کی پیش خبری بھی ہیں۔

ہمارا موقف کیا ہے؟

1990ء کی خلیجی جنگ کے موقع پر صدام حسین کی بغداد میں اسلامی ممالک کے نمائندگان کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی جس سے صدر صدام حسین نے بھی خطاب کیا تھا۔ اور امریکا سے اپنی جنگ کے بارے میں کھل کر اظہار خیال کیا تھا۔ یہاں اس خطاب کا اُردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے:

الحمد للہ الذی جمعنا علی الحق ان شاء اللہ

اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں حق پر متحد کیا۔ مجھے آپ سے مل کر بے انتہا خوشی ہو رہی ہے۔ اما بعد! اُردن میں منعقد ہونے والے ''مجلس التعاون العربی'' کے اجلاس میں ہم نے یہ وضاحت کی تھی کہ ہم ظلم اور جبر کے شدید خلاف ہیں۔ ہم نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ امریکا اس خطے میں اپنا تسلط قائم کر کے عربوں کو محکوم بنانا چاہتا ہے۔ ہم اس ذلت کو گوارا نہیں کر سکتے۔ ہم امریکا کی اس ظالمانہ پالیسی اور جابرانہ عزائم پر کسی بھی مصلحت کے تحت خاموشی اختیار نہیں کر سکتے۔ ہم نے 1990ء کے اوائل ہی میں اس بات کو واضح کر دیا تھا کہ امریکا اسلام اور مسلمانوں کا بالعموم اور عربوں کا بالخصوص دشمن ہے۔ وہ عربوں کے اتحاد اور اُن کی قوت کو اپنی موت سمجھتا ہے۔ 1990ء میں کوئی ایسا بحران موجود نہیں تھا' جسے خلیج کا بحران کہا جاتا ہو اور جسے بنیاد بنا کر امریکا ہمارے خلاف ہرزہ سرائی کر رہا ہے' مگر اس وقت بھی امریکا نے ہمیں دہشت گرد اور خطرناک قرار دیا تھا' کیونکہ وہ ہمارے وجود کو اپنے عزائم کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ تصور کرتا تھا۔ ہمارا یہ نظریہ ہے کہ جب عرب صحیح ہو جائیں گے تو اسلام بھی مضبوط ہو جائے گا اور اگر عرب کمزور پڑ جائیں یا غلط راستے پر چل نکلیں تو اسلام بھی کمزور پڑ جائے گا۔ یہ میرا ایمان ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے عربوں پر باقی مسلمانوں کی نسبت زیادہ ذمہ داریاں عائد کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرب سرزمین کو انبیاء و رُسل کا مرکز و مہبط بنایا۔ عربوں کو یہ شرف عطا کیا کہ انبیاء و رُسل ان میں سے ہوئے۔ وہ محمد ﷺ کے بھی اوّلین مخاطب تھے۔ عربوں کو اللہ نے اس خصوصیت سے نوازا۔ اب اگر عرب اپنی ذمہ داریوں کو نہ پہچانیں اور صحیح راستے پر نہ چلیں تو اسلام کی خاطر قربانی کون پیش کرے گا؟

مگر آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ عرب بگڑ چکے ہیں۔ وہ غلط راستے پر چل نکلے ہیں۔ ان کی معاشرت' ثقافت' سوچ' سیاست' اقتصادیات سب کچھ بگڑ چکا ہے۔ اگر ہم حقیقی مومن ہیں تو ہمیں عربوں کی اصلاح کی طرف توجہ دینا ہوگی تاکہ وہ اسلام کی خدمت کے قابل ہو سکیں اور اسلام کے پیغام کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچا سکیں۔

ہم عربوں کے کس کس مسئلے کو چھیڑیں۔ جس طرف نظر دوڑائیں ہمیں فساد ہی فساد نظر آئے گا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ عرب شہزادے' عرب حکمران' عرب امراء عیش وعشرت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ عورتوں کی منڈیاں لگتی ہیں اور ان عورتوں میں سے عرب وزراء و امراء کے لئے حسین وجمیل عورتوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ کیا یہ اسلام ہے؟ کیا یہ انسانیت کی تذلیل نہیں؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ عرب اس معاملے میں ساری دنیا میں بہت رُسوا اور بدنام ہو چکے ہیں۔

ہم اللہ کی طرف سے عطا کردہ دولت کو عیاشی پر ضائع کر رہے ہیں۔ آج مسلمانوں کی دولت عیش وعشرت میں اڑائی جا رہی ہے جبکہ لاکھوں بچے بوڑھے بھوک سے مر رہے ہیں۔ کیا یہ جائز ہے؟ کیا یہ درست ہے؟ کیا ہم یہ سب کچھ دیکھیں اور خاموشی اختیار کئے رکھیں؟

صرف تقلیدی کفر کے خلاف اعلانِ جہاد کرنا ہی جہاد نہیں' بلکہ ہمارا فرض ہے کہ ہم کفر کی طرف جانے والے راستوں کے خلاف بھی جہاد کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ عرب مضبوط ہوں اور خودمختارانہ زندگی بسر کریں۔ امریکا اور

برطانیہ کو ہمارے مسائل میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں ہونا چاہئے۔ آج امریکا کو بین الاقوامی اصول وقوانین یاد آ گئے ہیں۔ بین الاقوامی حد بندی یاد آ گئی ہے۔ آج سیکورٹی کونسل حرکت میں آ گئی ہے۔ ہم بھی بین الاقوامی اصولوں اور حد بندوں کا احترام کرنا چاہتے ہیں۔ ہم بھی چاہتے ہیں کہ فلسطینیوں کو اُن کا ملک واپس ملے اور قبلۂ اوّل آزاد ہو۔ وہاں سے یہودیوں کا تسلط ختم ہو۔ عربوں کو محکوم بنایا جا رہا ہے۔ اُن کی آبادیوں کو یہودیوں سے آباد کیا جا رہا ہے۔ اُن کے ملکوں کو تقسیم کیا جا رہا ہے۔ وہاں کے باشندوں کی تذلیل کی جا رہی ہے۔ اُس وقت انہیں بین الاقوامی اصول وقوانین یاد نہیں آتے' اُس وقت سیکورٹی کونسل حرکت میں نہیں آتی؟

ہم بھی حدود کی پابندی کرنا چاہتے ہیں۔ ہم بھی بین الاقوامی اصولوں کا احترام کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ سب کے لئے معیار ایک ہو۔ عربوں کے حقوق غصب کرنے والے اور عالمی قوانین کو پامال کرنے والے آج ہم سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہم بین الاقوامی قوانین کا احترام کریں۔ کیا اِن قوانین کا احترام اُن پر فرض نہیں ہے۔ کیا وہ اِن قوانین سے بالاتر ہیں؟ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے عالمی قوانین کو اپنے مکروہ عزائم کے لئے ڈھال بنا لیا ہے۔ خود جو چاہتے ہیں کرتے ہیں اور دوسروں کے معاملات میں حیلے بہانے سے مداخلت کرتے ہیں۔

ہم اس اندھیر نگری کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سب کو بین الاقوامی اصولوں کا پابند بنانا چاہتے ہیں۔ اور اب وہ وقت آ چکا ہے کہ ہم اس مسئلے کو عالمی سطح پر اٹھائیں اور سب کے لئے یکساں عالمی قوانین کو قابلِ احترام بنائیں۔

یہ سیکورٹی کونسل کیا ہے؟ کیا امریکا' روس' فرانس' چین اور انگلینڈ یہی دنیا کے پانچ ممالک ہیں جو اس کے ارکان ہیں؟ اِن کو کیا حق پہنچتا ہے عرب کے معاملات کو حل کرنے کا اور مداخلت کرنے کا؟ وہ کون ہوتے ہیں کہ آ کر ہمارے معاملات حل کریں؟ انہیں کیا حق ہے کہ وہ آئیں اور ہمارے مسائل میں ٹانگ اڑائیں؟ نہ اُنہیں ہماری ثقافت کا علم' نہ انہیں ہمارے اقتصادیات معلوم' نہ انہیں ہماری سیاست کا علم' نہ انہیں ہمارے مسائل کا علم۔ وہ ہمارے معاملات میں مداخلت کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ وہ خود تو جو چاہیں کرتے پھریں اور ہمارے لئے عالمی قوانین کا ڈنڈا لے کر آ جائیں۔ ہم بھی انسان ہیں اور وہ بھی انسان ہیں۔ اور اگر وہ خود بین الاقوامی اصولوں کا احترام نہیں کریں گے تو ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ وہ جھوٹے' مکار اور دغا باز ہیں۔ ہم اُن پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ عربوں کے مسائل عرب خود حل کر لیں گے۔ ہم انہیں مداخلت کا حق نہیں دیں گے۔ وہ بین الاقوامی قوانین کا احترام کروانا چاہتے ہیں تو انہیں خود بھی ان کا احترام کرنا چاہئے۔

آیئے' ہم سب بین الاقوامی قوانین کے تحت اپنے مسائل حل کریں' فلسطین کا مسئلہ بھی اور خلیج کا مسئلہ بھی۔ اور اگر وہ کہیں کہ نہیں' ہم پہلے خلیج کا مسئلہ حل کریں گے تو ہم بھی کہیں گے کہ نہیں' تمہارے لئے اولین ترجیح تیل ہے اور ہماری اولین ترجیح القدس کی آزادی ہے۔ ہر قوم اپنی ترجیحات کو ملحوظ رکھتی ہے۔ تمہارے لئے تیل اہم ہے اور ہمارے لئے القدس اہم ہے۔

اور میں یہ بات بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم کویت کو عراق کا حصہ کیوں سمجھتے ہیں؟ ہمارا شروع ہی سے یہ موقف رہا ہے کہ کویت بصرہ کا حصہ ہے۔ صدام پہلا شخص نہیں جس نے یہ کہا ہو۔ مجھ سے پہلے غازی ملک اور نوری السعید بھی اس کے لئے کوشش کرتے رہے ہیں۔ عبدالکریم قاسم جو سویت یونین کا دوست تھا' اُس نے کویت کی آزادی سے قبل انگریزوں سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وہ کویت کو بصرہ کی حدود سے ملا دیں' کیونکہ پہلے وہ بصرہ کا ایک جُزو تھا۔ اور جب 1961ء میں انگریزوں نے کویت کو اپنی استعماریت سے آزاد کیا اور اسے بصرہ کے ساتھ ملانے کی بجائے اپنے استعماری مقاصد کے لئے ایک مستقل ملک قرار دیا تو عبدالکریم قاسم کا نمائندہ اقوام متحدہ کے اجلاس سے واک آؤٹ کر گیا تھا اور انگریزوں کے اس فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ موقف صدام ہی کا نہیں' بلکہ مجھ سے پہلے عراقی حکام کا بھی یہی موقف رہا ہے۔

اس بات کی وضاحت کے بعد میں پھر اِس طرف آؤں گا کہ میرے بھائیو! ہمارے پاس قرآن مجید موجود ہے' ہمارے پاس رسول اللہ ﷺ کا اسوۂ حسنہ موجود ہے۔ ہم ان کی روشنی میں اپنے مسائل بہتر طور پر حل کر سکتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہی حق کا معیار اور کسوٹی ہیں۔ ہم صلح وآشتی کے ساتھ قرآن وحدیث کی روشنی میں اپنے مسائل حل کرنا چاہتے ہیں' لیکن کوئی بھی ایسا قدم جو ہمارے دشمنوں کی طرف سے اپنے مذموم مقاصد کیلئے اٹھایا جائے گا' ہم اس کا مقابلہ کریں گے۔ ہم باطل کے سامنے ہرگز نہیں جھکیں گے' خواہ ہمیں خون میں کیوں نہ نہانا پڑے۔ ہم قربانیاں دیں گے اور دشمنانِ دین کے مقاصد پورے نہیں ہونے دیں گے۔ عرب اپنے مسائل خود حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ ہمارے درمیان سے نکل جائیں' ہم بہتر طور پر مسائل پر قابو پا لیں گے۔ ہم فلسطین کا مسئلہ حل کرنے کی جانب توجہ دلاتے ہیں' لیکن کوئی نہیں سنتا۔ اس بارے میں سلامتی کونسل کی قراردادوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ آج جو ممالک اور اُن کے حکمران کویت پر سلامتی کونسل کی قراردادوں کے لئے بے چین ہیں' فلسطین کے مظلوموں کے لئے اُن کا دل کیوں نہیں دھڑکتا؟ ہم نے کتنی مرتبہ سلامتی کونسل میں مسئلہ فلسطین پیش کیا ہے' مگر کسی نے توجہ نہیں دی۔ سلامتی کونسل اپنا وقار کھو چکی ہے۔ نہ یہ عالمی ہے اور نہ یہ امن کی کونسل ہے' بلکہ یہ بش کا تابع دار ایک ادارہ ہے' میں اس کا احترام نہیں کر سکتا۔

میرے بھائیو! مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ عراق کی قوت عالم اسلام کی قوت ہے' اور اسے ضائع نہیں ہونا چاہئے' مگر وہ قوت جس کا اللہ ہم سے مطالبہ کرتا ہے وہ ایسی قوت ہے جو ظلم کے آگے نہ جھکے۔ اور کوئی بھی قوت جو ظلم کے آگے جھک جائے وہ قوت نہیں کہلا سکتی۔ عراق کی قوت اُس وقت تک اسلام کی قوت نہیں کہلا سکتی جب تک وہ ظلم کے خلاف سینہ سپر نہ ہو جائے۔

6 اگست (1990ء) سے پہلے جب ہم نے امریکا کو للکارا تھا اور اس کے ظلم کے خلاف ڈٹ گئے تھے اُس وقت سے عراق امریکا کے دل میں کھٹکتا ہے۔ ہم نے کہا تھا کہ اگر اسرائیل جارحیت سے باز نہ آیا تو ہم اس پر حملہ کریں گے' مگر انہیں ایٹم بم کا گھمنڈ تھا۔ اللہ کے فضل سے ہمارے پاس بھی اتنی طاقت موجود ہے کہ ہم نصف اسرائیل کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیں گے۔ 6 اگست سے بہت پہلے امریکا ہمارے خلاف محاذ آرائی شروع کر چکا تھا۔ کویت پر حملہ ہم نے دفاعی نقطۂ نظر سے کیا ہے' باوجود اس کے کہ انگریز کی تقسیم سے قبل کویت بصرہ کا جز تھا' مگر ہم کویت سے بھائیوں کی طرح سلوک کر رہے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ ہم آپس میں بھائی بھائی بن کر رہیں اور کوئی ہمارے درمیان رخنہ اندازی نہ کرے۔ ہم صلح وآشتی کے ساتھ رہ رہے تھے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ کوئی سازشی آئے اور ہم میں سے کسی کو اپنی سازش کا شکار بنائے' مگر افسوس امریکا نے کویت کو اپنی سازش کے جال میں پھانس لیا اور ایک بھائی کو دوسرے بھائی کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیا۔ امریکا کا اپنا مفاد تھا۔ اس کا واحد مقصد تیل پر قبضہ جمانا تھا اور کویت اُن کی اس سازش کا شکار ہو گیا۔

کویت پر حملہ تو 2 اگست کو ہوا ہے۔ 2 اگست سے قبل امریکا ہمارے خلاف سازشیں کیوں کر رہا تھا؟ صرف اس لئے کہ عراق نے فلسطین کی آزادی کا نعرہ بلند کیا تھا

سید ضمیر جعفری

جال اور چال

جال تھا ' ابلیس کی تبلیس کا
چال تھی ''ٹام اور انکل سام'' کی
زر خرید اقوام کی مخلوط جیش؟
جنگ ہے صدام سے ''خُدام'' کی

اور القدس کو یہودیوں کے پنجے سے آزاد کرانے کا عزم ظاہر کیا تھا۔

عراق نے امریکا کی اس سازش کو بے نقاب کیا تھا کہ وہ تیل پر قبضہ کر کے پوری دنیا پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ ہم چاہتے تھے کہ وہ تیل پر قبضہ کرنے کی بجائے خرید و فروخت کرے۔ وہ ہم سے خریدے۔ ہم انہیں فروخت کریں' جو ایک عالمی اصول ہے' مگر یہ کہ وہ آئے اور تیل پر قبضہ کر لے اور عربوں اور مسلمانوں کو اپنا محکوم بنا لے' ہم اُسے یہ نہیں کرنے دیں گے۔ ہم نے یہی بات اردن میں 1990ء میں کہی تھی۔ ہم اپنی اس بات سے کبھی دست بردار نہیں ہوں گے۔

ہم جنگ نہیں چاہتے ہیں۔ ہم نے اپنے ہاتھوں سے بغداد کو تعمیر کیا ہے۔ جب ہم نے زمامِ اقتدار سنبھالی تو پورے بغداد میں صرف دو محل تھے اور ایک ہوٹل تھا جس کا نام بغداد ہوٹل ہے اور آج کل وہ ٹویا تھری سٹار ہے۔ ہم نے بغداد کو تعمیر کیا' اُسے آباد کیا' ہم جنگ کر کے یہ سب کچھ برباد نہیں کرنا چاہتے۔ ہم نے اس کے لئے راتوں کی نیند قربان کی ہے۔ ہم نے اس کے لئے بڑی مشقتیں اٹھائی ہیں۔ اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے بغداد کو ہم اپنے ہاتھ سے برباد نہیں کرنا چاہتے۔ ہم امن چاہتے ہیں' جنگ نہیں چاہتے۔

آخر میں میں یہ کہنا چاہوں گا کہ عربوں کے مسائل عربوں کو حل کرنے دیئے جائیں۔ کوئی اجنبی قوت ہمارے سر پر سلامتی کونسل اور بین الاقوامی اصولوں کا ڈنڈا لے کر سوار نہ ہو۔ اگر تمام عرب مل بیٹھیں' اور سرفہرست سعودی عرب ہے' تو بہت سے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ افسوس ہے کہ سعودی عرب اس وقت خود مختار نہیں۔ اسے اپنے فیصلوں پر اختیار نہیں۔ وہ صبح کو ایک بیان جاری کرتے ہیں اور شام کو انہیں اس کی تردید کرنا پڑتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ امریکا مقدس سرزمین میں داخل ہو چکا ہے اور آج مقدس مقامات کو اس سے خطرات ہیں۔

سید ضمیر جعفری

بُش اور کُش

انسانیت عزیز ہے' انسان کُش پسند
ہے جنگ ناپسند' مگر جارج بُش پسند

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

بانی تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** صاحب

کی تقاریر و دروس پر مشتمل

قیمت فی VCD -/40 روپے

وڈیو سی ڈیز

1۔ جہاد فی سبیل اللہ	2 VCDs
2۔ قائداعظم اور علامہ اقبال کا نظریہ پاکستان	2 VCDs
3۔ عظمتِ مصطفیٰ ﷺ	2 VCDs
4۔ شادی بیاہ کی رسومات اور ان کا حل	1VCD
5۔ متاع الغرور (دنیا دھوکے کا سامان)	1VCD
6۔ توبہ کی عظمت اور تاثیر	1VCD
7۔ منتخب نصاب (جاری)	53VCDs
8 بیان القرآن قرآن مجید کا ترجمہ اور مختصر تشریح	108CDs

ملنے کا پتہ: **مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن**

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 03-5869501

SEEKING TRANSLATORS

Tanzeem-e-Islami is seeking Rufaqa who possess the ability to translate Tanzeem's Urdu material into English. This work will be carried out on purely a voluntary basis and Rufaqa from anywhere in the world can take part. Rufaqa interested in contributing to this cause should send their CV's to either info@tanzeem.org (**Subject: Seeking Translator**) OR mail to:

Adnan Rehman, Qur'an Academy,
36-K, Model Town, Lahore.
Ph: (042)5869501-3 Fax: (042)5834000

حصّہ چہارم

خلیج کا فتنہ عظیم

(یہاں خلیجی جنگ کے اسباب' مقاصد اور نتائج کے بارے میں مولانا خلیل احمد الحامدی کا تجزیہ پیش کیا جاتا ہے جو جنگ کے اواخر میں ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' میں چھپ کر اکثر اخبارات و جرائد میں نقل ہوا تھا)

''خلیج کا یہ فتنہ کسی ایک فریق کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا بے لاگ مطالعہ کیا جائے تو نقشہ یہ بنتا ہے:

(1) صدام حسین 1979ء میں عراق کا صدر بنا۔ اس کا تعلق بعث پارٹی سے تھا۔ یہ پارٹی ترقی پسندانہ نظریات اور اشتراکیت اور الحاد کی حامل تھی۔ شام کی بعث پارٹی اور عراق کی بعث پارٹی میں فرق یہ تھا کہ شام کی بعث پارٹی پر نصیر یہ (باطنی فرقہ جو حضرت علی ﷺ کو خدا' اور شریعت کو منسوخ سمجھتا ہے) کا غلبہ تھا اور عراق کی بعث پارٹی پر سنی العقیدہ گروہ کا قبضہ تھا۔ بعث پارٹی کی حکومت نے اسلام کے نام لیواؤں پر بڑے مظالم کئے۔ بعث پارٹی اور صدام حسین کا یہ کردار سب کو معلوم تھا' مگر اس کے باوجود ماسوائے شام' تمام عرب ممالک کے ساتھ عراق کے تعلقات دوستانہ رہے۔ 1974ء میں جب خاکسار بغداد کی ایک اسلامی کانفرنس میں شریک ہوا تو میں نے اس میں دیکھا کہ سعودی علماء بھی شریک تھے' بلکہ کارروائیوں میں پیش پیش تھے۔

(2) ایران میں جب انقلاب آیا تو مشرق اوسط میں ایک نئی صورت حال پیدا ہو گئی۔ ایرانی انقلاب نے امریکہ کے خلاف زبردست آواز بلند کی۔ پورے مغرب میں ایران کو مستقبل کا خطرہ قرار دیا گیا۔ خلیجی ممالک بھی لرز اٹھے۔ چنانچہ ایک بین الاقوامی سازش کے تحت 1980ء میں عراق اور ایران میں جنگ چھیڑی گئی' تاکہ ایران کو کمزور کیا جا سکے۔ افسوس ہے کہ اس جنگ کو امت مسلمہ کے اندر طرح طرح کے تعصبات بھڑکانے کا ذریعہ بنایا گیا۔ کبھی اسے عرب و عجم کی جنگ کہا گیا (اس زمانے میں سعودی حکومت کی طرف سے ایک کتاب تقسیم کی گئی' جس کا نام تھا: ''جاء دور المجوس'' (مجوسیوں کا دور لوٹ آیا)۔

ایرانیوں کی طرف سے بھی تکریت (صدام کا قبیلہ) اور آل سعود کے خلاف بڑا لٹریچر چھاپا گیا۔ کبھی شیعہ اور سنّی کیمپوں کی جنگ بنایا گیا۔ اس سلسلے میں بھی لاکھوں کی تعداد میں فریقین نے ایک دوسرے کے خلاف لٹریچر پھیلایا۔ سعودی عرب کے دینی حلقے ڈاکٹر عبداللہ ترکی (ریکٹر امام محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی) اور ڈاکٹر عبداللہ نصیف (سیکرٹری جنرل رابطۂ عالم اسلامی) کی قیادت میں شیعہ مذہب اور امام خمینی کے افکار کے خلاف عراق کے ساتھ مل کر دنیا کے اندر پروپیگنڈہ مہم چلاتے رہے۔ ایران کی طرف سے بھی نہایت خطرناک جوابی کارروائیاں کی گئیں۔

اس جنگ میں خلیجی ممالک نے سعودی عرب کی قیادت میں صدام حسین کا آخر دم تک ساتھ دیا۔ صدام جب جنگ میں کودا تھا تو اس کے پاس 36 بلین ڈالر کا سرمایہ تھا۔ جنگ کے دوران اس نے 150 بلین ڈالر خرچ کئے اور جب اگست 1988ء میں جنگ بند ہوئی تو صدام 70 بلین ڈالر کا مقروض تھا۔ جنگ پر آنے والے مصارف زیادہ تر سعودی حکومت اور امیر کویت نے دیئے (6/جنوری 1991ء کو خود شاہ فہد بیان دے چکے ہیں کہ انہوں نے 25 ارب ڈالر صدام حسین کو دیئے ہیں۔ کویت نے اس سے بھی زیادہ دیئے)۔

(3) جنگ کے خاتمے کے بعد عراق کنگال ہو گیا۔ قرض نے اس کے ہوش و حواس گم کر دیئے۔ خلیجی دوست ساتھ چھوڑ گئے۔ خلیجی دوستوں نے الٹا یہ محسوس کیا کہ عراق کے پاس ایک ملین (دس لاکھ) فوج ہے اور اسلحے کے ذخائر اس نے بے پناہ جمع کر لئے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ مستقبل میں خود ان کے لئے خطرہ بن جائے۔ اسرائیل نے بھی یہی خطرہ محسوس کیا۔ صدام جنگ آزما تھا۔ اس نے دور اندیشی کا ثبوت نہ دیتے ہوئے کویت پر چڑھائی کر دی اور پورا علاقہ' بلکہ پوری مسلم دنیا ایک شدید آزمائش سے دوچار ہو گئی۔

(4) عراق کے کویت میں داخلے کے چھ دن بعد سعودی حکومت کی دعوت پر امریکی افواج اور پھر بین الاقوامی (اتحادی) افواج تیزی سے سعودی عرب میں اترنا شروع ہو گئیں۔ بش حکومت نے اس سلسلے میں اس قدر عجلت اور سرگرمی دکھائی کہ اس نے پوری کافر دنیا اور متعدد مسلم ممالک کو عراق کے خلاف جنگ کے لئے تیار کیا۔ ایک ملک کے خلاف پوری مغربی طاقت کا ایسا اجتماع پہلے تاریخ میں کم ہی ہوا ہے۔ جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوم میں بھی مغرب منقسم تھا۔ اب مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ یہود و نصاریٰ اور کمیونسٹ اور بت پرست ریاستیں ان کے ایک اہم ملک کے خلاف باہمی چپقلش کے باوجود اکٹھی ہو گئی ہیں۔ ان سب کے پیش نظر عراق کی عسکری' اقتصادی' ایٹمی' تہذیبی اور ثقافتی طاقت کو پاش پاش کرنا ہے۔ اگر عراق مٹ گیا تو پھر اس علاقے میں اسرائیل ہی اصل طاقت ہو گا۔ خلیجی ممالک کا پٹرول اور دفاع بھی بالواسطہ اسرائیل کے زیر اثر ہوں گے۔

اس پس منظر میں خلیجی جنگ کا اصل کردار صرف عراق کو قرار دینا درست نہیں ہے۔ وہ سب فریق اس میں شامل ہیں جو عراق کو یہاں تک دھکیل کر لائے ہیں۔ امریکہ کے مطبخ میں یہ تمام کھچڑی پکائی گئی ہے اور علاقے کے مسلمان دانستہ و نادانستہ اب اسے کھانے پر مجبور ہیں۔ اسے کھا کر آگے ان کا جو انجام ہونے والا ہے' وہ خدا ہی بہتر جانتا ہے' مگر ظلم کرنے اور ظالم کا ساتھ دینے والے قہر خداوندی سے نہیں بچ سکتے۔

ہم کیا سوچتے ہیں؟

کہا جاتا ہے کہ علاقائی حکمرانوں نے کویت اور عراق کو سمجھانے کی بڑی کوشش کر دیکھی تھی' مگر وہ ناکام ہو گئے۔ اب اس کے سوا اور کوئی حل نہ تھا کہ جنگ کا راستہ اختیار کیا جائے۔ خاکسار کے نزدیک یہ جواب صحیح نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اگر جناب شاہ فہد علاقے کی بڑی محترم شخصیت ہیں' وہ اگر خصوصی تگ و دو کرتے تو اللہ تعالیٰ انہیں ضرور کامیابی سے ہمکنار کرتا۔ 16 دسمبر 1990ء کو جب ان سے جدہ کے ''قصر البحر الاحمر'' میں ہماری طویل ملاقات

ہوئی تو انہوں نے صاف کہا کہ صدام میرا بھائی ہے' بلکہ تمام حکمرانوں کی بہ نسبت وہ مجھ سے قریب ترین ہے۔ میں اسے یقین دلاتا ہوں کہ سعودی عرب کی سرزمین سے ایک گولی بھی نہیں چلائی جائے گی۔ اس طرح جب ہم 22 ستمبر 1990ء کو بغداد میں صدام سے ملے تو انہوں نے بار بار کہا کہ سعودی عرب کے ساتھ میرا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مجھ سے یہ ضمانت لے لی جائے کہ میں سعودی عرب پر حملہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔

یہ محبت بھرے فقرے دونوں فریقوں کی زبان پر سن کر ہمارا اندازہ تھا کہ صدام اور فہد اگر ایک دوسرے سے مل لیں تو یہ جھگڑا ختم ہو سکتا ہے اور کویت کے نقصان کی تلافی بھی ہو سکتی ہے۔ دل میں بار بار یہ سوال اٹھتا ہے کہ یہ دونوں حضرات آخر باہم کیوں نہ ملے۔ اس کا جواب مجھے ایک سعودی دوست نے یہ دیا کہ سعودی عرب میں امریکی افواج آنے کے بعد اب یہ تمام معاملہ بش کے ہاتھ میں چلا گیا۔ بش اگر چاہے گا تو دونوں میں مذاکرات ہوں گے' نہ چاہے گا تو نہیں ہوں گے۔ چنانچہ واضح دکھائی دے رہا ہے کہ بش نے اس مسئلے کے سیاسی حل کی نہ خود کوئی جدوجہد کی اور نہ کسی اور جدوجہد کو کامیاب ہونے دیا۔ عراق کی اقتصادی ناکہ بندی سے لے کر جنیوا میں طارق عزیز کے مذاکرات تک ہمیں کہیں سنجیدہ کوشش نظر نہیں آتی۔ جو شخص جنگ کے لئے اس قدر تیاریاں کر رہا تھا' وہ سیاسی حل کیوں ہونے دیتا؟ اس نے ٹھیک اپنے منصوبے کو منزل تک پہنچایا ہے۔ اب یہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے کہ بش اس منصوبے سے مطلوبہ نتائج حاصل کر سکتا ہے یا نہیں۔

کچھ لوگ اس غصے کا اظہار کر رہے ہیں کہ مسلمان عراق کا ساتھ کیوں دے رہے ہیں؟ بعض اسلامی تنظیموں کو بھی یہ لوگ یہ طعنے دے رہے ہیں کہ یہ تنظیمیں کویت اور سعودی عرب کی امداد پر پلتی رہی ہیں' اور اب وہ کیوں سعودی عرب کا ساتھ نہیں دیتیں۔ اصولاً یہ اعتراض درست ہے' مگر اس لابی کو ہمارا جواب یہ ہے کہ:۔

(1) آپ لوگوں کی سوچ درست نہیں ہے۔ اسلامی تنظیمیں امریکہ اور اسرائیل کی مخالفت کر رہی ہیں۔ آپ لوگ اگر امریکہ اور اسرائیل کی مخالفت کو سعودی عرب کی مخالفت قرار دیتے ہیں تو آپ خود اپنے موقف پر نظر ثانی کریں کہ آپ کہاں کھڑے ہو گئے ہیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ سعودی عرب اور امریکہ و اسرائیل ایک کیمپ بن جائیں۔ سعودی عرب نے اپنی حفاظت کے لئے امریکی فوج بلائی تھی۔ عراق سے جنگ کے لئے نہیں بلائی تھی۔ چنانچہ عراق نے سعودی عرب پر حملے کی ابتدا نہیں کی۔ جنگ کا آغاز بھی امریکہ نے کیا ہے' عراق نے نہیں کیا۔ لہٰذا آپ امت مسلمہ کے امریکہ اور صیہونیت پر غیظ و غضب کو سعودی عرب کے کھاتے میں نہ ڈالیں۔ سعودی عرب ایک واجب الاحترام ملک ہے۔ اس کے حکمران خود اسرائیل کے خلاف ہر تحریک میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ سعودی عرب کے اخبارات امریکی سازشوں کو بے نقاب کرتے رہیں۔ روزنامہ المدینہ' الجزیرہ' عکاظ اور الریاض کی فائلیں دیکھ لیں۔ الریاض کا مذہبی مجلہ "الدعوۃ" کئی قسطوں میں یہ مضمون چھاپ چکا ہے کہ امریکہ خلیج پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی سازش کر رہا ہے۔ کویت کے اخبار المجتمع الوطن' السیاسہ اور القبس سب امریکہ کا سامراجی چہرہ بے نقاب کرتے رہے ہیں۔

(2) مسلمانانِ عالم کے اندر عراق کی ہمدردی یکا یک ابھر آنے کی وجہ یہ ہے کہ خلیج میں جنگ کا نقشہ خلیجی حکمرانوں نے صحیح تیار نہیں کیا۔ اگر اس کی قیادت شاہ فہد اور امیر کویت کے ہاتھ میں ہوتی' اور جنگ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ شاہ فہد کرتے تو لوگوں کے جذبات مختلف ہوتے' بلکہ شاید جنگ شروع ہی نہ ہوتی۔ مسلم دنیا صدام کو مجبور کر دیتی کہ وہ خادم حرمین شریفین کی بات کو رد نہ کرے۔ اس کے برعکس اب نقشۂ جنگ یہ ہے کہ ایک طرف صدام ہے اور دوسری طرف بش اور پوری کافر دنیا۔ ایک طرف عراقی فوج اور عراق کا سابقہ اسلحہ جنگ ہے اور دوسری طرف امریکہ' انگلستان' فرانس' اٹلی' ہالینڈ اور دیگر ممالک کی فوج اور امریکہ اور یورپ کے کارخانوں میں تیار ہونے والا جدید ترین اسلحہ اور بارود (جدید سے جدید تر اسلحہ پہلی مرتبہ یہاں آزمایا جا رہا ہے)۔ خلیج کے تمام حکمران پس منظر میں چلے گئے ہیں۔ اب آپ خود ہی بتائیے کہ کیا ایک مسلمان بش کو صدام پر ترجیح دے گا۔ صدام اگر جارح اور ظالم ہے تو بش اس سے بڑا ظالم ہے اور اسلام اور مسلمانوں کا دشمن ہے۔ اسرائیل پر عراق نے چند سکڈ میزائل پھینکے ہیں تو بش نے فوراً پیٹریاٹ میزائل اور دیگر سامان اور ماہرین اسرائیل روانہ کر دیئے ہیں۔ کیا آپ حضرات مجھ جیسے گنہگار سے یہ توقع رکھیں گے کہ میں آج بش زندہ باد اور صدام مردہ باد کہوں (حالانکہ میں بارہ سال سے صدام مردہ باد کہتا رہا ہوں)۔

(3) اس جنگ کے جو اثرات ہوں گے' وہ تو بعد میں دیکھے جائیں گے' لیکن میں تمام خلیجی حکمرانوں' بشمول صدام سے یہ پوچھتا ہوں کہ جن عرب آبادیوں پر بم برسائے جا رہے ہیں' وہ کون ہیں؟ میں قارئین کو قابل اعتماد ماخذ کے حوالے سے بتاتا ہوں کہ نجد' احساء' کویت' بصرہ' بحرین اور قطر میں جو قبائل آباد ہیں' وہ آپس میں رشتہ دار ہیں۔ ان کے آباء ایک ہی ہیں۔ بعض قبائل کے تو باہم نہایت قریبی رشتے ہیں۔ بصرہ اور زبیر اور نجد کے متعدد قبائل دونوں قسم کی شہریت رکھتے ہیں' سعودی بھی اور عراقی بھی۔ بہت سے قبائل کویتی اور سعودی شہریت میں مشترکہ ہیں۔ کیا یہ جنگ ان قبائل کے اندر نہ مٹنے والے اثرات نہ چھوڑے گی؟ کیا یہ قبائل جو شیر و شکر ہو رہے ہیں۔ اب باہم ازلی دشمن نہ بن جائیں گے؟ اس قبائلی عداوت سے کس کو نقصان ہوگا؟ کیا یہ بش کا نقصان ہے یا جان میجر کا؟ یہ نقصان علاقے کے حکمران کا ہے۔ یہ نقصان آل سعود' آل صباح' آل خلیفہ ثانی' آل نکریت کا ہے' بلکہ یہ نقصان ملت اسلام اور ملت عرب کا ہے۔ یہ نقصان ہر اس عرب کا ہے جو قرآن پر ایمان رکھتا ہے۔

آخر میں میں شاہ فہد خادم حرمین شریفین سے التجا کرتا ہوں کہ جناب غلاف کعبہ پکڑ کر خدا سے دعا کریں کہ خدا ان کے ہاتھوں اس فتنہ عظیم کو ختم کرائے۔ صدام اگر ضد پر ہے اور عقل و خرد سے عاری ہو چکا ہے' اگر شیخ جابر الاحمد الصباح کی سوچ جواب دے چکی ہے' اگر شاہ حسین اور حسنی مبارک عاجز آ چکے ہیں تو خادم حرمین شریفین اپنی اس عاجزانہ سالی میں اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ وہ اس جنگ کو ختم کرنے کے لئے ہیرو بن جائیں۔ وہ اعلان کر دیں کہ ہم عراقی مسلمانوں کی خون ریزی نہیں چاہتے۔ ایک شخص کی غلطی کی سزا پوری عراقی قوم بلکہ پوری ملت عرب کو نہیں دی جا سکتی۔ مجھے امید ہے کہ ایک موحد حکمران جب دل سے یہ اپیل کرے گا تو یقیناً خدا اس میں اثر پیدا کرے گا اور خلق خدا بھی بآواز بلند آمین کہے گا۔ صدام کا دل بھی نرم ہوگا اور شاید وہ کویت کو اسی طرح چھوڑ دے جس طرح اس نے آٹھ سال جنگ لڑ کر ایران کا کچھ رقبہ فتح کیا اور بیک جنبش قلم ایران کو بخش دیا۔

ایسے کا اخلاقی جائزہ

خلیجی جنگ کے سیاسی اور مادی تجزیے مسلسل ہو رہے ہیں' لیکن مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا ایمان ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے' اس کی تہہ میں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور وہ اخلاقی ضابطے کارفرما ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے نظام کائنات کے لئے وضع فرما رکھے ہیں۔ ان اخلاقی ضابطوں کی روشنی میں ہم جنگ خلیج کے اسباب و عوامل کا جائزہ لیتے ہیں۔ یہ جائزہ ہمارے اپنے ذاتی مطالعے کا عکاس ہے۔ حقیقی علم صرف ذات خداوندی کو ہے۔ شروع میں یہ بھی وضاحت کر دوں کہ اس مضمون سے میرا مدعا عیب چینی نہیں ہے' بلکہ مرض کی نشان دہی ہے۔ گو مضمون کا محور خلیجی ممالک اور خلیجی معاشرہ ہے' مگر پاکستان اور دیگر مسلم ممالک بھی اسی طرح کے حالات سے دوچار ہیں جو اس مضمون میں بیان کئے گئے ہیں۔ صالح افراد اور پاکیزہ اداروں کی خلیج میں بھی کمی نہیں ہے' مگر اللہ کی سنت ترجیحات

کے تحت فیصلے کرتی ہے۔

یہ جنگ جزیرۃ العرب میں برپا ہے۔ اصطلاحی لحاظ سے ''جزیرۃ العرب'' سے مراد وہ تمام علاقہ ہے جو اس وقت سعودی عرب پر مشتمل ہے۔ نیز کویت' بحرین' قطر' امارات اور یمن بھی اکثر روایات کے مطابق جزیرۃ العرب کا حصہ ہیں۔ آنحضور ﷺ نے جزیرۃ العرب کے بارے میں فرمایا تھا: ''جزیرۃ العرب میں دو دین اکٹھے نہیں ہوں گے''۔ حضور ﷺ کی مراد یہ تھی کہ جزیرۃ العرب اب اسلام کی سرزمین بن گیا ہے۔ اس میں اسلام کے ساتھ کسی اور دین کی عمل داری نہیں ہونی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ ''یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکال دیا جائے''۔ یہ لوگ اسلام کی بنیاد منہدم کرنے کے لئے مسلسل سازشیں کر رہے تھے۔ چنانچہ پوری اسلامی تاریخ میں جزیرۃ العرب کا بیشتر حصہ یہود و نصاریٰ کی بالادستی سے محفوظ رہا (یعنی موجودہ سعودی عرب اور شمالی یمن)۔ اب علماء کے حلقوں میں یہ بحث شدت کے ساتھ چھڑی ہوئی ہے کہ سعودی عرب میں کفار (یہود و نصاریٰ) کی فوجیں اتر آئی ہیں۔ سعودی علماء اپنی ضرورت کے تحت ان افواج کو بلانا جائز قرار دیتے ہیں' مگر کچھ دوسرے علماء اس اضطرار کو قبول نہیں کر رہے۔ یہ بحث ابھی تک دینی حلقوں میں جاری ہے۔

جزیرۃ العرب کے صرف ایک حصے میں (سعودی عرب میں) شریعت کے فوجداری' شخصی اور عدالتی احکام نافذ ہیں۔ جہاں تک سیاسی نظام کا تعلق ہے تو وہاں خاندانی بادشاہت ہے جو موروثی نظام پر قائم ہے۔ شورائیت کا وہ نظام رائج نہیں ہے جو اسلام اور خلفائے اسلام کی تعلیمات میں ہمیں ملتا ہے۔ نیز حکمران خاندان کے افراد کو دوسرے شہریوں کی نسبت خصوصی مراعات حاصل ہیں۔ اُن کی وجہ سے عام شہریوں کے اندر ان کے بارے میں زبردست شکایات پائی جاتی ہیں اور کبھی کبھار دبی زبان سے اس کا اظہار بھی ہوتا رہتا ہے۔ راقم السطور نے ایک مرتبہ امام محمد بن سعود اسلامی یونیورسٹی کے ایک استاد سے گاڑی میں بیٹھے یہ شکایت کی کہ ''سعودی عرب کے پاس بے پناہ مالی وسائل تھے۔ اس نے اپنا دفاع اس قدر کیوں نہ مستحکم کیا کہ اسے امریکی افواج کا سہارا (کم از کم ایک ہفتے تک) نہ لینا پڑتا' جبکہ اسرائیل بھی پڑوس میں بیٹھا زبردست جنگی طاقت بن چکا ہے؟''۔ استاد موصوف نے جواب دیا کہ ''خلیجی بحران نے ہمارے بہت سے عیوب بے نقاب کر دیئے ہیں۔ ان میں یہ کمزوری بھی ہم پر واضح ہو گئی ہے''۔ ہماری یہ گفتگو سن کر گاڑی کا ڈرائیور یکایک بولا کہ ہمیں دس ہزار شہزادوں نے چوس رکھا ہے۔ ہمارا دفاع کیسے مستحکم ہوتا'' (یہ گاڑی اور ڈرائیور شاہی پروٹوکول سے تعلق رکھتے تھے)

پورے جزیرۃ العرب میں خاندانی اور شخصی بادشاہتیں اور شیخی ریاستیں ہیں۔ شورائی نظام کی حقیقی روح مفقود ہے۔ مغربی طرز زندگی کا رواج خوفناک حد تک بڑھ چکا ہے۔ گھروں کے اندر تقریباً وہی لباس پہنا جاتا ہے اور بود و باش کے وہی ڈھنگ اختیار کئے جاتے ہیں جو مغرب میں ملتے ہیں۔ مغرب کی عشرت میں کفایت شعاری کا اصول کام کرتا ہے اور یہاں اسراف و تبذیر۔

پچھلے دو عشروں سے خاص طور پر جزیرۃ العرب میں (ماسوائے یمن) دولت کی بڑی ریل پیل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت بالغہ کے تحت ان علاقوں کو ''زمین پھاڑ'' کر سیال سونے سے نوازا' چنانچہ سعودی عرب میں فی کس سالانہ آمدنی کا اوسط 10 ہزار ڈالر (تقریباً سوا دو لاکھ روپے) اور کویت میں 13 ہزار ڈالر (تقریباً دو لاکھ 86 ہزار روپے) ہے۔ یہ اوسط دنیا کے درجۂ اول میں شمار ہوتا ہے۔ یہ کثرتِ غنا اگر اخلاقی و ایمانی قیود میں نہ رہے تو پھر وبالِ جان بن جاتی ہے۔

آنحضور ﷺ کا ارشاد مبارک ہے: ''مجھے تمہارے فقر سے کوئی خطرہ نہیں۔ مجھے تمہاری کثرت دولت سے خطرہ ہے''۔ کثرتِ غنا نے خلیجی ممالک میں جو امراض جنم دیئے ہیں۔ ان کی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔ یہ امراض تو دوسری اقوام میں بھی ہیں' مگر امراض کے نتائج اس وقت برآمد ہوتے ہیں جب توازن بگڑ جائے۔

عربوں کی کثرتِ دولت کے نتائج

(1) اسراف اور فضول خرچی: کثرتِ دولت نے سب سے بڑی اور خطرناک بیماری جو خلیجی ممالک میں پیدا کی ہے' وہ اسراف اور فضول خرچی ہے۔ انفرادی سطح پر اور اجتماعی سطح پر بھی۔ عام رہن سہن سے لے کر کھیلوں کے میدان تک اسراف کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔ قیمتی سے قیمتی موٹروں کی فراہمی' اشیائے تعیش کی بے حد فراوانی' گراں ترین پارچات اور مغرب و جاپان کی منڈیوں سے آنے والا آبدار فرنیچر تو اب ''ضروریاتِ زندگی'' کی فہرست میں شامل ہو چکا اور شاید ان چیزوں کی افراط ایک حد تک گوارا بھی کی جا سکتی ہے۔ اصل چیز وہ آوارہ مزاجی ہے جو اسراف پیدا کر دیتا ہے اور پھر بطن و جنس اور تنعم و تن آسانی زندگی کا محور بن جاتی ہے۔ بقائے حیات کے لئے جو محنت و جفاکشی اور عرق ریزی درکار ہوتی ہے' وہ مفقود ہو جاتی ہے۔ اسراف کی قباحت اس وقت اجاگر ہوتی ہے جب اسراف کے مقابلے میں فقر و غربت کے مناظر سامنے آتے ہیں۔

ایک خلیجی حکمران نے سمندر کے اندر کئی کلومیٹر رقبے میں پتھر ڈال کر زمین تیار کروائی اور پھر وہاں اپنا ''قصر الحمراء'' بنوایا' حالانکہ زمین کی اس کے پاس کمی نہیں ہے۔

آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس پورے منصوبے پر کتنے ارب ڈالر خرچ آئے ہوں گے۔ دوسری جانب اس کے پڑوس میں قحط اور غربت و افلاس سے انسانی زندگی سسکیاں لے رہی ہے۔ خلیج میں کھیلوں کے انسٹرکٹروں کو (جو یورپ سے لائے جاتے ہیں) کھیلوں کی تربیت دینے کے لئے جو معاوضہ دیا جاتا ہے' اس سے کئی غریب ممالک کا سالانہ بجٹ بھی کم ہوتا ہے۔ کویت میں راقم السطور نے اپنے آخری دورے میں ''مدینہ ترفیہیہ'' (ڈزنی لینڈ کی طرح کا سٹی) دیکھا۔ ریت کے صحرا میں ایک وسیع و عریض الیکٹرونک آلات کے ذریعے کام کرنے والی تفریح گاہ۔ ٹک ٹک دیدم' دم نہ کشیدم۔ ایسا ہی ایک شہر ابوظہبی میں بنانے کا منصوبہ ہے۔ جب پوشاک اور عطریات فرانس سے ورے خریدنا ذوق کے منافی ہو جائے' رولز رائس گاڑی ثانوی تعلیم (انٹر) پاس کرنے والے بچے کو باپ تحفے میں دے' شکار کا شوق پورا کرنے کے لئے ایک عقاب کی قیمت ایک ملین (دس لاکھ) ریال بھی معمولی ہو اور اونٹوں کی دوڑ لگانے کے لئے اغوا شدہ کم سن بچے خرید کر انہیں اونٹوں پر باندھ کر ریس کا شوق پورا کیا جاتا ہو تو پھر اللہ تعالیٰ کی سنت اپنی عطا کردہ نعمتوں کا حساب چکانے میں دیر نہیں لگاتی۔

(2) غرور و تکبر: دوسری بیماری جو کثرت دولت نے جنم دی' استکبار ہے۔ خلیج کا ایک طبقہ' اور اچھا خاصا طبقہ' اس بیماری میں مبتلا ہو گیا اور یہ بیماری اجتماعی زندگی میں اس قدر سرایت کر گئی کہ ادارے اور افراد دونوں اس کی لپیٹ میں آ گئے۔ انسان اور انسان میں فرق ہونے لگا۔ ''تیسری دنیا'' کے لوگ (میرے نزدیک یہ اصطلاح نہایت غلط اور گھناؤنی ہے' لیکن متکبرین اسی کو استعمال کرتے ہیں' اس لئے میں بھی مجبوراً اسے استعمال کر رہا ہوں) متکبرین کی نظر میں ''رفیق'' ہیں اور امریکہ اور یورپ کے سفید فام ''خواجہ''۔ دونوں لفظوں کا مطلب خلیج میں تقریباً غلام اور آقا کے ہم معنی بن گیا تھا۔ اگر معاملہ الفاظ و القاب تک رہتا' تب بھی غنیمت تھا' لیکن اصل فرق یہ پیدا ہوا کہ یکساں قابلیت و محنت کے باوجود ''رفیق'' ایک ہزار تنخواہ کا مستحق ہے اور خواجہ ''دس ہزار'' بلکہ اس سے بھی زیادہ کا حق دار ہے۔

ترجیحات کا بھی تناسب' گفتگو' لین دین' میل جول اور پذیرائی کے آداب میں بھی سرایت کر گیا۔ خدا کے چند بندوں کے سوا (جو اس احساس کمتری سے مبرا ہیں)' کیا بڑا اور کیا چھوٹا' کیا دکاندار اور کیا ٹیکسی ڈرائیور' کیا معلم اور کیا شرطی (پولیس مین)' کیا ویزا افسر اور کیا ٹکٹ کلرک' ہم جیسے ''تھرڈ ورلڈ'' کے باسیوں کو ''رفیق'' کہہ کر دل کی تسکین حاصل کر لیتے ہیں' اور جب کسی پوائنٹ پر تلاشی کا مسئلہ

درپیش ہوتا ہے تو تھرڈ ورلڈ کی پوسٹ کندہ تلاشی لی جاتی ہے اور سفید فاموں کو جھک کر سلام کیا جاتا ہے۔ دنیا کا ''اشرف ترین'' انسان امریکی ہے اور ارذل ترین انسان جنوبی ایشیا کے کسی ملک کا رہنے والا ہے۔ ایک مرتبہ میں کویت کے ایئر پورٹ پر ویزے کے انتظار میں کھڑا تھا تو دیکھا کہ سری لنکا کی فلائٹ سے مردوں اور عورتوں کی بڑی تعداد آئی۔ امیگریشن والے ان کو ایک قطار میں کھڑا کرنے کے لئے لاتوں سے ٹھوکریں مارتے تھے۔ اس منظر نے میرے دل پر شدید اثر کیا۔ اسلام نے انسان کو اشرف المخلوقات کہا ہے اور یہاں انسانیت کی توہین کی جا رہی ہے' اسلام کے علمبرداروں کے ہاتھوں!

استکبار نے ذہنوں کے اندر ایک نرالی بیماری جنم دے دی ہے۔ اسے عوامی عربی میں ''تخمیط'' کہتے ہیں۔ یہ بیماری شہزادوں کے خادموں سے شروع ہوئی اور نچلے طبقوں کی نوخیز نسل تک پہنچ گئی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ بے فکرے لڑکوں کی ٹولیاں نئی نئی موٹریں (شیورلیٹ' پونیاک' ڈاج' بیوک' والوو' مرسیڈیز'' لے کر پرہجوم سڑکوں پر نکل آتے ہیں اور موٹریں پوری رفتار سے چلا کر پھر یکایک ان کو گردش دیتے ہیں۔ موٹر اس تیز رفتاری میں پہیے اٹھا کر گھوم جاتی ہے۔ یہ دیکھ کر پاس سے گزرنے والے مسافروں کے دل دہل جاتے ہیں۔ انہیں تو اپنی جان کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ نیز جب کوئی میچ اختتام پذیر ہوتا ہے تو پھر کامیاب ٹیم کے حامی گراؤنڈ سے واپس گھروں کو آتے ہوئے اس قدر خرمستی کرتے ہیں کہ اس وقت شرفا گھروں سے نکلنا پسند نہیں کرتے' نہ کسی مرد کی پگڑی محفوظ اور نہ کسی عورت کی عزت کا لحاظ۔

استکبار اور اسراف ان دونوں بیماریوں نے خلیجی مخلوق کو گھن کی طرح کھا لیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرعون کی یہی دو بیماریاں بیان کی ہیں: ﴿اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ (فرعون متکبر اور اسراف کرنے والوں میں سے تھا)۔ آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ جو خصلت ناپسند ہے' وہ کبر ہے۔ حدیث قدسی میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''الکبر ردائی'' یعنی کبر میری چادر ہے۔ خاکسار بیس سال سے اس ردائے الٰہی پر دست درازی کے مناظر دیکھتا رہا ہے۔

(3) سود کی لعنت: سود کی لعنت تو اس وقت پوری دنیا پر چھائی ہوئی ہے۔ اور یہ وہ جرم ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے خلاف جنگ قرار دیا ہے۔ خلیج میں چونکہ سرمائے کی بہتات رہی ہے' اس لئے وہاں سودی کاروبار بھی وسیع پیمانے پر ہوا ہے' اور اسی تناسب سے اس کے برے نتائج بھی برآمد ہوئے ہیں۔ افراد بھی اس کاروبار میں بری طرح ملوث ہوئے ہیں (چند نیک لوگوں کو چھوڑ کر) اور حکومتیں بھی پوری طرح سودی معیشت کے اندر تہہ تک اترتی رہی ہیں۔ دنیا کا کوئی ایسا نامور بینک نہیں ہے جس نے سعودی عرب' کویت' امارات وغیرہ میں اپنی شاخ نہ کھول رکھی ہو یا مقامی بینک کے ساتھ رشتہ نہ جوڑا ہو۔ بحرین تو علی الخصوص مغربی بینکوں کا اڈا بن چکا ہے۔ لوگوں نے بڑے مزے لے کر سود کھایا ہے۔ چنانچہ سود خوری نے خلیجی عربوں کے اندر مادہ پرستی اور حب دنیا کا زبردست رجحان پیدا کر دیا۔ اس کا تجربہ آپ ان غیر ملکی کمپنیوں اور ایشیائی ملازمین کے حالات سے کر سکتے ہیں جو سعودی عرب اور قطر میں کام کرتی رہی ہیں۔ سعودی ٹھیکیدار اور ان کے سرپرست اونچے خاندانوں سے تعلق رکھنے والے لوگ مالی معاملات میں انتہائی ظالم' سنگ دل اور طوطا چشم (الا ماشاء اللہ) ثابت ہوئے ہیں' انفرادی پہلو سے دیکھا جائے تو کفیلوں تک نے بردہ فروشی کی ذہنیت کا ثبوت دیا۔ اپنے زیر کفالت لوگوں کا خون چوسا۔ ان سے بدعہدی کی' نازیبا انداز میں گفتگو کی اور دوسروں کو اذیت دے کر لطف اندوزی حاصل کی۔ سود خوری یہی کردار ادا پیدا کرتی ہے۔ ایک تعمیراتی فرم کے بارے میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ وہ حکومت سے 1500 ریال فی مزدور وصول کرتی ہے اور مزدوروں کو 500 ریال فی کس کے حساب سے ادا کرتی ہے۔

(4) بینکنگ کی لعنت: سود کی وجہ سے بینک کاری کا نظام بھی سود خور ہے۔ خلیجی حکومتوں نے اپنا بیشتر سرمایہ امریکی بینکوں میں رکھا ہوا ہے۔ صرف کویت کے 100 بلین ڈالر وہاں جمع ہیں۔ سعودی عرب اور امارات اور قطر کا بھی زیادہ تر محفوظ سرمایہ امریکہ اور یورپ کے بینکوں میں ہے۔ اس سرمائے پر سود کی رقم اس حد تک مل جاتی ہے کہ ملکی بجٹ کا 80 فیصد حصہ صرف سود خوری رقم سے پورا ہو جاتا ہے۔ گویا خلیجی عرب ممالک میں جو ترقیاتی کام ہوئے ہیں' سڑکوں' ہسپتالوں' تعلیمی اداروں اور محلات کی تعمیر' سامان ضرورت اور اشیائے زیبائش اور جدید ترین آلات کی چمک دمک' یہ سب سود کی مرہون منت ہے۔ ایک خلیجی ملک میں میرے ایک دوست بتاتے ہیں کہ ''میں جس ادارے سے وابستہ ہوں' اس کا کام یہ ہے کہ وہ ریاست کے سرمائے کو دنیا کے اندر ایسی جگہ لگائے' جہاں زیادہ سے زیادہ سود ملتا ہو''۔ میرے دوست نے یہ بات اپنی پریشانی کے اظہار کے لئے کہی کہ وہ ایک سودی ادارے کے وابستہ ہو کر رزق حلال سے محروم ہے۔

سودی بینکوں کے مقابلے میں پچھلے دس سال سے اسلامی بینکوں کا قیام بھی عمل میں آ رہا ہے اور نیک اور رزق حلال کے خواہش مند حضرات نے اپنا سرمایہ اسلامی بینکوں میں رکھا ہے' مگر سودی بینکوں اور عرب ساہوکاروں کی طرف سے ان بینکوں کی مخالفت اور تضحیک بھی زبردست کی گئی ہے۔ عراق کے کویت میں داخلے (2 راگست 1990ء) سے چند روز پہلے تک کویت کے اندر روزنامہ الوطن' الانباء اور السیاسہ کے صفحات گواہ ہیں کہ کس بھونڈے انداز میں کویت کے اسلامی بینک (بیت التمویل الکویتی) کے خلاف پروپیگنڈا کیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں اسلامی احکام اور قرآنی آیات کی تضحیک کی گئی۔ الزام تراشیاں کی گئیں اور شکوک وشبہات پھیلا کر اس بینک کو بند کرانے کی کوشش کی گئی۔ خود حکمران خاندان (آل صباح) کے نمایاں افراد بھی پس پردہ اس مہم کو ہوا دے رہے تھے۔

کویت کے مالی سکینڈل سے' جسے ''سوق المناخ'' کہتے ہیں' لوگ واقف نہیں۔ عالمی پریس میں یہ سکینڈل تفصیلات کے ساتھ چھپ چکا ہے۔ چند کویتی سرمایہ داروں نے مل کر ایک کاغذی کمپنی قائم کی اور پھر اس کے حصص فروخت کئے۔ یہ حصص خرید خرید کر لوگوں نے آگے بیچے۔ آج ایک حصص کی قیمت اگر ایک لاکھ دینار ہے تو چھ ماہ کی مدت دے کر اس کی قیمت فروخت ڈیڑھ لاکھ دینار رکھ دی گئی۔ سودی کاروبار کی یہ نہایت قبیح شکل عام لوگوں کے اندر رواج دی گئی۔ کویت کے چند خداوند ترس لوگوں کے سوا' بڑے بڑے مالدار لوگ مزید دولت کے لالچ میں اس میں بہہ گئے' مگر ڈیڑھ سال کے اندر یہ کاغذی کاروبار دھڑام سے نیچے گر گیا اور کئی گھرانے طمع کی بھینٹ چڑھ کر کنگال ہو گئے۔ سود کے شوق میں اصل سرمائے سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

(5) فحاشی کا فروغ: کثرت دولت نے فحاشی کو بھی بڑا رواج دیا۔ اگر اس پہلو کا جائزہ لینا ہو تو دبئی اور بحرین کے ہوٹلوں کو دیکھ لیں۔ بحرین اور الخبر (سعودیہ) کے درمیان سمندر پر پل تعمیر ہو چکا ہے۔ جمعرات اور جمعہ کو لوگ سعودی عرب سے تفریح کے لئے بذریعہ کار بحرین آتے ہیں اور ہوٹلوں کی رونق بنتے ہیں۔ شراب وشباب کی مارکیٹ عروج پر آ جاتی ہے' اور پھر خوف خدا رکھنے والے لوگ دل مسوس کر رہ جاتے ہیں (جنگ سے پہلے) کویت میں غیر ملکی خادماؤں کی بھرمار تھی۔ بھارت' سری لنکا' فلپائن اور تھائی لینڈ سے یہ ''خادمائیں'' لائی جاتی تھیں۔ جمعہ (جو چھٹی کا دن ہے) اور اتوار (جو عیسائیوں کے چرچ کا دن ہے) کو تفریحی پارکوں میں ان خدماؤں کے جمگھٹے لگتے ہیں' کنیزوں کی منڈی کا سا سماں پیدا ہو جاتا ہے' اور پھر طرح طرح کے قصے کہانیاں لوگوں کی زبان پر ہوتے ہیں۔

جدہ میں ہمارے ایک دوست نے ایک ایسا ادارہ قائم کر رکھا ہے جو لقطاً (نومولود بچے جو پارکوں اور سڑکوں

کے کنارے عورتیں پھینک جاتی ہیں) کی پرورش کرتا ہے۔ ہمارے دوست نے آبدیدہ ہو کر بتایا کہ ہماری گاڑیاں روزانہ صبح سویرے پارکوں اور سڑکوں کا چکر لگاتی ہیں اور ایسے بچوں کو اٹھا کر لے آتی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ یہ خوفناک اور شرم ناک صورت حال نہ صرف جدہ میں ہے' بلکہ مکہ معظمہ میں اور خود حرم شریف میں بھی بعض اوقات ایسے بچے مل جاتے ہیں۔ انہوں نے ایک سال کے اندر ایسے تین سو بچے اکٹھے کئے۔ یہ وہ المناک حادثات ہیں جو مانع حمل کی تمام تدابیر اختیار کرنے کے باوجود پیش آ جاتے ہیں۔

خلیجی دنیا کا نظارہ کرنا ہو تو گرمیوں میں بینکاک' مئیلا' مراکش اور سپین اور یورپ کے دیگر شہروں کی تفریح گاہوں کے اعداد و شمار جمع کر لئے جائیں۔ یہاں بھی میں یہ عرض کروں گا کہ جہاں ایک طرف کچھ فواحش کے جوہڑ میں غرق ہیں' وہاں نیک اور پارسا لوگ بھی نیکی کی اعلیٰ مثالیں پیش کرتے ہیں۔

(6) نسلی و قبائلی تعصب: قبائلی اور نسلی تعصب قوموں کے لئے تباہ کن ہوتا ہے۔ خلیج میں "عرب قومیت" کا تعصب تو ایک مدت سے محسوس ہوتا تھا' مگر اب اس میں مزید ترقی یہ ہوئی کہ خود عرب اقوام کے اندر علاقائی تعصب کی لہر اٹھ کھڑی ہوئی۔ یمنی' حجازی' کویتی' بحرینی اور دیگر علاقوں اور قومیتوں کے نام سے صفوں میں پھوٹ پیدا گئی ہے۔ اس کی ایک خطرناک صورت کویت کے وہ پچاس ہزار افراد ہیں' جنہیں "بدون" کہا جاتا ہے۔ یعنی ان کی کوئی شہریت نہیں ہے۔ یہ قبائلی بدو بروقت اپنی شہریت کا انتظام نہ کر سکے۔ کویت سے اٹھتے' سعودی عرب کے منطقۂ مشرقیہ پہنچ جاتے' بصرے اور زبیر کی جانب وقتاً فوقتاً کوچ کر جاتے' اور جب مردم شماری کا وقت آیا اور شناختی کارڈ (ہویہ) جاری ہوئے تو انہوں نے کوئی توجہ نہ دی' اور یوں وہ شہریت سے محروم ہو گئے۔ نہ ان کے لئے کوئی ملازمت' نہ علاج و تعلیم کی سہولت' نہ سفر کے پروانے حاصل کرنے کا حق اور نہ کسی روزگار کے مواقع۔ یہ 50 ہزار افراد "بدون" (یعنی بلاشہریت) بن کر رہ گئے۔ زمین ان پر تنگ ہو کر رہ گئی۔ کیا کسی اسلامی ملک میں انسانوں کے ساتھ یہ سلوک شرعاً اور اخلاقاً جائز ہے؟ امریکہ میں تو کوئی بچہ پیدا ہو جائے تو خواہ اس کی ماں اسی روز امریکہ میں اتری ہو' اسے نیشنلٹی مل جاتی ہے اور کویت میں پچاس ہزار انسان "بدون" بنے رہے۔

(7) آبادی کی کمی: جغرافیہ اور آبادی میں فرق اگر اعتدال سے بڑھ جائے تو کمزوری شروع ہو جاتی ہے۔ کویت کا رقبہ 17 ہزار مربع کلومیٹر ہے اور آبادی جو اصل کویتیوں پر مشتمل ہے دس لاکھ سے کم۔ سعودی عرب کا رقبہ 24 لاکھ مربع کلومیٹر اور آبادی کسی بھی صورت 80 لاکھ سے زیادہ نہیں (پاکستان کا رقبہ 8 لاکھ تین ہزار 9 سو 40 مربع کلومیٹر ہے اور آبادی دس کروڑ سے زیادہ)۔ یہ وسیع علاقہ اور اتنی کم آبادی' کمزوری ہے طاقت نہیں۔ اگر خلیجی ممالک تعصب اور تنگ نظری سے کام نہ لیتے تو اپنی آبادی بڑھا سکتے تھے۔ دولت تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بافراط دے رکھی تھی' ساتھ ہی مین پاور بڑھ جاتی تو وہ ہر میدان میں ترقی کرتے اور دفاع میں اتنے یتیم نہ ہوتے کہ اپنے ہی ایک دوست اور بھائی ملک یعنی عراق کی جارحیت کے جواب میں دنیا کی تمام کافر طاقتوں کو اپنے گھر بلا لیتے۔

(8) عدل اور علم کی کمی: ملکوں اور قوموں کی بقا کا اسلامی اصول یہ ہے کہ اگر کسی قوم کا نظامِ زندگی عدل اور علم پر استوار ہو گا تو اللہ تعالیٰ اسے دنیا میں پنپنے کا موقع دے گا' خواہ وہ کافر قوم ہو' اور اگر ظلم اور جہالت کسی قوم کا وطیرہ ہو تو پھر وہ ختم ہو جاتی ہے اور جہد للبقا کی جنگ میں بازی نہیں جیت سکتی۔ اور اگر کوئی قوم عدل کے اوصاف کے ساتھ خدا پرست اور انبیائے کرام کی پیرو بھی ہو تو اسے اللہ تعالیٰ کی سنت دوسروں پر ترجیح دے گی۔ عدل اور علم یہ دو بنیادی ستون حیات ہیں۔ ان دونوں ستونوں کو بروئے کار لانے کے لئے اجتماعی زندگی میں شورائیت' آزادئ رائے اور علمی خود انحصاری ضروری ہے۔ ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ یہ برتر اسلامی اقدار خلیجی ممالک میں بہت بڑی حد تک مفقود ہیں۔ حکمرانوں کے اردگرد جو ٹولہ حاشیہ برداری پر مامور ہے' وہ بھی اپنا صحیح فریضہ ادا نہیں کر رہا' بلکہ صرف چاپلوسی اور خوشامد سے اپنی دنیا بنانے میں مگن ہے۔ دینی حلقوں کی حالت بہت پتلی رہی ہے۔ بھاری بھرکم تنخواہوں اور دیگر سہولتوں نے انہیں کند کر دیا ہے۔ چند افراد کے نام ضرور اس باب میں جرأت و حق گوئی کے شاندار نمونے کے طور پر سامنے آتے ہیں مثلاً محترم شیخ عبدالعزیز بن باز (سعودی عرب)' شیخ محمود عبدالطیف (بحرین)' شیخ احمد القطان (کویت) اور شیخ علی الحویتی (امارات)۔ اسلامی تحریک نے بھی نوجوانوں کی ایک کھیپ تیار کی ہے جو استبدادی اور استحصالی نظام کے خلاف ہے' مگر بایں ہمہ آزادئ رائے مفقود ہے' ظلم و ستم کی حکمرانی ہے اور مغرب پرستی کا جنون ہے۔ ان سب باتوں نے مل کر اس المیے کو جنم دیا ہے جو خوفناک اسلحہ اور بارود اور انسانی تباہی کے جدید ترین آلات کا روپ دھار کر خلیج میں تعزیر خداوندی بن چکا ہے۔

مسلمانوں کو اس المیے سے عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ اگر وہ اس المیے کے محض تماشائی بن کر رہ جائیں گے تو وہ خود بھی اس کی لپیٹ میں آ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "منکرین پر مسلسل ان کے اعمال کے نتیجے میں آفات ٹوٹتی رہتی ہیں۔ ان کے پڑوس میں نازل ہوتی رہتی ہیں اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہتا ہے جب اللہ کا اصل وعدہ نہیں آ جاتا' اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو سیدھی راہ نہیں سجھاتا"۔ (سورۂ رعد)

سید ضمیر جعفری

تضاد

دل میں تو ہے بسی ہوئی' صدام ہی کی ذات
لیکن ہمارے ہاتھ ہیں امریکنوں کے ساتھ

پس پردہ اصل حقائق

معلوم و معروف تو یہی ہے کہ خلیج میں فتنے کا آغاز 2 راگست 1990ء کو ہوا' جب عراقی فوجیں کویت میں داخل ہو گئیں' مگر راقم السطور کے نزدیک یہ رائے سطحی اور حالات کا گہرا مطالعہ نہ رکھنے کی بنا پر ہے۔ اس فتنے کا آغاز اس وقت ہو گیا تھا جب عراق کے مطالبات کے سامنے کویتی قیادت نے حکیمانہ موقف اختیار کرنے کی بجائے متکبرانہ رویہ اختیار کیا۔ عراق کے تین مطالبات تھے:

(1) ایک یہ کہ عراق کویت کا 17 ارب ڈالر قرضہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ یہ رقم عراق نے ایران کے خلاف جنگ میں صرف کی ہے۔ ایران کے خلاف جنگ پوری خلیج کے دفاع و حفاظت کے لئے لڑی گئی ہے اور عراق نے اپنے 6 لاکھ انسان اس جنگ کی نذر کئے ہیں' لہٰذا اس سے قرض نہ وصول کیا جائے۔

(2) دوسرا یہ کہ الرمیلہ کے نام سے پٹرول کا جو کنواں ہے' وہ زیادہ تر عراق کی سرحد میں ہے اور جن دنوں عراق جنگ میں مشغول تھا' حکومت کویت یہاں سے چوری سے تیل نکال کر بیچتی رہی ہے' جس کی کل مالیت اڑھائی ارب ڈالر ہے۔ کویت کو یہ رقم ادا کرنی چاہئے۔

(3) تیسرا یہ کہ بوبیان اور وربہ کے دونوں جزیرے جو خلیج کے ساحل پر واقع ہیں' عراق کو دیئے جائیں تاکہ عراق کے پاس بھی سمندر کا کوئی راستہ ہو۔ عراق کے دعوے کے مطابق یہ دونوں جزیرے اصلاً بصرہ کا حصہ ہیں' مگر دوسری جنگ عظیم میں انگریزوں نے انہیں بصرے سے کاٹ کر کویت کمشنری میں شامل کر دیا تھا اور اب یہ دونوں عراق کو واپس کر دیئے جائیں۔

عراق کے یہ مطالبات درست تھے یا نہیں' اس سے ہمیں بحث نہیں ہے' البتہ ہم اس بات پر حیران ہیں کہ کویت نے نہایت متکبرانہ انداز میں یہ مطالبات مسترد کر دیئے اور

یہ خیال نہ کیا کہ صدام کویت اور دوسری خلیجی ریاستوں کا دوست' بلکہ ان کا چہیتا اور ''مجدد عرب'' ہے۔ جب جنگ کی حالت میں اسے سو ارب سے زیادہ ڈالر کی امداد دے دی تھی تو جنگ کے بعد اس کی اقتصادی بدحالی کی رعایت کرتے ہوئے اسے مزید کچھ دے دیتے (اس کی اقتصادی بدحالی کو اس ایک مثال سے سمجھ سکتے ہیں کہ جنگ سے پہلے ایک عراقی دینار 3 کویتی دینار کے مساوی تھا اور جنگ کے بعد ایک کویتی دینار 20 عراقی دینار کے مساوی ہو گیا)۔ اور اب عراق پر حملے' بلکہ عراق کی تباہی کے لئے اتحادی فوجوں پر جو اربوں ڈالر صرف کئے جا رہے ہیں' کیا اس سے یہ بہتر نہ تھا کہ عراق کے ناز نخرے برداشت کر لئے جاتے اور مل جل کر اس کی گرتی ہوئی معیشت کو سہارا دے دیا جاتا؟

اس پس منظر میں راقم یہ سمجھتا ہے کہ خلیج کے فتنے کا آغاز کویت کے متکبرانہ رویئے کے وقت ہی ہو گیا تھا۔ راقم نے کویت کے رویئے کو ''متکبرانہ'' اس لئے کہا ہے کہ کویت اور عراق کے مابین آخری مذاکرات میں جو یکم اگست 1990ء کو جدہ میں ہوئے (عراقی فوجوں کے کویت میں داخلے سے ایک روز پیشتر)' ان میں کویت کے وزیر اعظم سعد عبداللہ نے عراقی وفد کے تمام مطالبات دوبارہ مسترد کر دیئے۔ عراقی وفد نے جب اپنے مطالبات کے حق میں سخت رویہ اختیار کیا تو کویت کے وزیر اعظم نے عربی زبان میں جواب دیتے ہوئے ایسا بھونڈا جملہ منہ سے نکالا' جس نے نہ صرف عراق کی اتھارٹی کو چیلنج کر دیا بلکہ عراق کی غیرت و حمیت کو آگ لگا دی۔ وہ جملہ یہ تھا: ''اعلی مافی خیلک ارکب'' (اے عراقی فوج کے جنرل' تیرے اصطبل میں جو اچھے سے اچھا گھوڑا ہے' اس پر سوار ہو کر آ جا اور ہم سے جو وصول کرنا ہے' کر لے''۔

راقم اس جملے کی معنویت کو خوب سمجھتا ہے۔ جب بحث و مباحثہ میں ایسے جملے تک نوبت پہنچ جائے تو سمجھ لیجئے کہ جس فریق کو یہ جملہ کہا گیا ہے' اس کی دماغی کیفیت غیر متوازن ہو جائے گی۔ چنانچہ کویت کے اسی متکبرانہ بلکہ جاہلانہ جملے نے عراقی فوجیوں کو برافروختہ کر دیا۔ تاریخ میں ہمیشہ غیر متوازن جملوں ہی نے تباہی کو دعوت دی ہے۔ یہی حرکت کویت نے کی (اور ظاہر ہے کسی خفیہ سہارے ہی کی بنا پر کی ہو گی) اور جو فتنہ ملتوی ہو سکتا تھا' اسے قریب تر کر دیا۔

اس فتنے کی اصل منصوبہ بندی بھی اب طشت از بام ہو چکی ہے۔ امریکہ خلیج میں اترنے کے لئے اور خلیج کے وسائل پر قبضہ کر کے اسلامی آواز کو دبانے اور اپنا ''نیا عالمی نظام'' نافذ کرنے کے لئے جو منصوبے پچھلے عشرے سے لے کر اب تک تیار کرتا رہا ہے' وہ امریکی لٹریچر میں چھپ چکے ہیں اور اہل علم اس سے پوری طرح آگاہ ہو چکے ہیں۔

فتنے کا آغاز کویت کے تکبر کو سمجھیں یا صدام حسین کی جارحانہ کارروائی کو' مگر اس تمام منظر کی ہدایت کاری امریکہ نے کی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان اسے آزادیٔ کویت کی جنگ سمجھنے کی بجائے عراق کی عسکری قوت (جو اسرائیل کے لئے خطرہ بن چکی تھی) کی تباہی' خلیجی پٹرول پر قبضہ (جو اب ہو چکا ہے) اور نئے عالمی نظام (نیو ورلڈ آرڈر) کے عنوان سے مغربی تہذیب کی ترویج (جسے اب شروع کر دیا گیا ہے) قرار دیتے ہیں' اور دلچسپ بات یہ ہے کہ امریکہ کے ان عزائم کو خود خلیج کے لوگ بھی اچھی طرح سمجھتے تھے اور اب بھی سمجھتے ہیں۔

میرے پاس کویت کے ایک نہایت مشہور و مقبول مجلے ''المغربی'' کا شمارہ اپریل 1988ء میں موجود ہے۔ اس میں ''المغربی'' کے تجزیہ نگار نے ایک مضمون بڑی محنت سے مرتب کیا ہے' جس کا عنوان ہے ''امریکیوں کی نظر میں خلیجی عربوں کا مقام''۔ مضمون نگار نے امریکی لٹریچر کے تجزیئے کے ساتھ ساتھ ہالی وڈ کی ان فلموں کا بھی جائزہ لیا ہے جو خلیجی مستقبل کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ ان میں ایک فلم' جو 1974ء میں ہالی وڈ نے تیار کی' الدفاع الافضل (The Best Defence) نام کی ہے۔ اس فلم میں دکھایا گیا ہے کہ عراقی فوجیں کویت میں داخل ہو جاتی ہیں اور پھر انہیں نکالنے کے لئے امریکی فوجیں خلیج میں آ جاتی ہیں جو بالآخر عراقیوں کو نکال دیتی ہیں اور پھر یہ فوجیں کویت میں باقاعدہ پڑاؤ کر کے کویتی نوجوانوں کو جنگی تربیت دیتی ہیں۔ اس موقع پر امریکی فوجوں کا کمانڈر زیر تربیت کویتی نوجوانوں کے بارے میں اپنے تاثر کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے: ''یہ بے وقوف اور بزدل لوگ''۔ گویا خود کویت کا ایک مشہور مجلہ اپنے قارئین کو امریکہ کے عزائم سے آگاہ کر رہا ہے۔ یہی بات آج دنیا بھر کے لوگ خلیجی نوجوانوں کو بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ تمہارے علاقے میں امریکیوں کی آمد تمہاری کسی ہمدردی اور محبت کی بنا پر نہیں' بلکہ تمہاری آزادی سلب کرنے' تمہاری تہذیب و ثقافت مٹانے اور تمہاری تیل کی دولت (جو اس وقت تمہاری شہ رگ ہے) لوٹنے کے لئے آئی ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ وضاحت خلیج کے ممالک سے ہمدردی ہے یا ان سے بے وفائی اور طوطا چشمی ہے؟

چند روز ہوئے' میرے ایک کویتی دوست نے جو اس وقت لندن میں ہے' بذریعہ فیکس مجھے ایک دستاویز بھیجی ہے۔ یہ دستاویز دراصل برطانیہ کے وہ راز ہیں جو برطانوی قانون کے مطابق ہر تیس سال کے بعد اوپن کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ دستاویز 1960ء کی ایک کارروائی پر' برطانوی وزارت خارجہ میں عرب ڈیسک کا ایک نوٹ ہے' جس میں بتایا گیا ہے کہ عبدالکریم قاسم نے (جو 1960ء میں عراق کا فوجی حکمران تھا) یہ فیصلہ کیا کہ وہ کویت پر قبضہ کرے۔ (یہ بات کویت کی آزادی سے ایک سال پہلے کی ہے)' لہٰذا عرب ڈیسک کی یہ رائے ہے کہ: ''عبدالکریم قاسم کو یہ موقع دیا جائے' اور پھر جب وہ کویت میں داخل ہو جائے تو برطانیہ اپنی فوج کویت بھیجے اور عراق کو نکال کر خود کویت کی حفاظت اپنے ذمے لے''۔ میرا کویتی دوست مجھے لکھتا ہے کہ جو کام برطانیہ 1960ء میں کرنا چاہتا تھا' وہ کام امریکہ 1990ء میں سرانجام دے رہا ہے (عراق کو امریکہ نے خود موقع دیا کہ وہ کویت میں آ جائے اور پھر اس بہانے امریکہ سعودی عرب میں پورے ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ بین الاقوامی بارات کو لے کر آ گیا ہے)۔

امریکہ آئندہ کیا چاہتا ہے؟ اس کا اندازہ آپ اس ایک چھوٹی سی خبر سے لگا سکتے ہیں جسے متحدہ عرب امارات کے روزنامے ''الاتحاد'' (28 فروری 1991ء) نے شائع کیا ہے۔ خبر یہ ہے: ''امریکی فوج کی انجینئرنگ کور نے امیر کویت کے ساتھ 40 ملین ڈالر کا ایک نیا معاہدہ کیا ہے۔ انجینئرنگ کور اس رقم سے کویت کی آزادی کے بعد فی الفور سڑکوں اور پلوں کی مرمت کرے گی' تاکہ امریکی فوج کو کویت کے اندر نقل و حرکت میں کوئی دشواری پیش نہ آئے''۔

نیز اخبار ''الاتحاد'' (28 جنوری 1991ء) ہی کے مطابق کویت کے 50 ماہرین اقتصادیات اور منصوبہ ساز' واشنگٹن میں کویت کی تعمیر نو کے لئے مختلف امریکی کمپنیوں سے 40 ارب ڈالر تک کے معاہدے کر رہے ہیں' جن کی رو سے وہ کویت کے لئے اسپرین کی ٹکیہ سے لے کر فرنیچر تک ان کمپنیوں سے خریدیں گے۔ گویا کویت میں امریکی فوج بھی اپنا بسیرا کرے گی اور امریکی کمپنیاں بھی کویت کی پوری معاشی زندگی کی سرپرستی کریں گی۔ سرپرستی تو وہ پہلے بھی کرتی تھیں' مگر دوست کی حیثیت سے۔ اب ان کی سرپرستی آقا کی حیثیت سے ہو گی۔ دنیا بھر کے مسلمان اگر اس جنگ میں غمگین ہوئے ہیں اور امریکہ کے خلاف بپھرے ہوئے ہیں تو اس کی یہی وجہ ہے کہ وہ اس جنگ کو امریکہ کی ایک خوفناک سازش سمجھتے ہیں۔

تنظیم اسلامی کا پیغام — نظامِ خلافت کا قیام

حصّہ پنجم

جنگ جاری رہے گی!

جولائی 1991ء میں اقوام متحدہ کی کوششوں سے پہلی خلیجی جنگ کا خاتمہ ہوا' لیکن جنگ پھر بھی جاری رہی۔ امریکہ کے غیر معمولی دباؤ کے تحت عراق پر طرح طرح کی معاشی وتجارتی پابندیاں عائد کرنے کے لئے سلامتی کونسل نے متعدد قراردادیں منظور کیں اور اُن پر عمل بھی کرایا۔ تباہی پھیلانے والے ہتھیار برآمد کرانے کے لئے بارہ سال تک سرزمین عراق کا چپہ چپہ معائنہ کاروں نے چھان مارا' لیکن اسلحہ برآمد نہ ہوا۔ ان بارہ برسوں میں عراق پر کیا گزری' اختصار کے ساتھ پہلے اُن کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

عہد صدامیہ کے خاص واقعات

1979ء۔ صدر حسن البکر کے بعد 16 جولائی کو صدام حسین انقلابی کمانڈ کونسل کے صدر' جمہوریہ عراق کے صدر' بعث پارٹی کے سیکریٹری جنرل بنے۔

1980ء۔ نیشنل اسمبلی بنانے کے لئے ایک نیا قانون وضع کیا گیا' جس کے نمائندگان بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر چار سال کے لئے منتخب کئے جایا کریں گے..... شط العرب کے مسئلے پر عراق ایران جنگ چھڑ گئی۔

1981ء۔ 7 جون کو اسرائیلی فضائیہ ''آپریشن بابل'' کے نام سے عراق پر اچانک فضائی حملہ کر کے عراق کے ایٹمی ری ایکٹر کو تباہ کر دیتی ہے۔

1988ء۔ عراق ایران جنگ اقوام متحدہ کی کوششوں سے 20 اگست کو بند ہو جاتی ہے۔ اس جنگ میں فریقین کے اندازاً تین لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔

1990ء۔ عراقی افواج 2 اگست کو کویت پر حملہ کرتی ہیں..... 6 اگست کو اقوام متحدہ کی جانب سے عراق پر اقتصادی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔

1991ء۔ امریکہ کی قیادت میں اور اقوام متحدہ کی منظور سے 17 جنوری کو ''ڈیزرٹ سٹورم آپریشن'' عراق کے خلاف پوری شدت سے شروع ہوتا ہے..... 27 فروری کو کویت کو عراقی افواج سے چھڑا لیا جاتا ہے اور اگلے روز 28 فروری کو بغداد پیسز فائر کی شرائط قبول کر لیتا ہے۔

1992ء۔ جنوبی عراق میں شیعہ آبادی کے تحفظ کی خاطر 27 اگست کو ''نوفلائی زون'' بنایا جاتا ہے۔

1993ء۔ اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر 715 کو بغداد غیر مشروط طور پر تسلیم کر لیتا ہے' جس میں کہا گیا تھا کہ عراق اپنے اسلحے کی نگرانی اور معائنہ کرائے گا۔

1996ء۔ 3 ستمبر کو عراق پر ایک اور حملہ کیا گیا' جس میں امریکی بحری جہازوں سے عراق کے فوجی اہمیت کے ٹھکانوں پر 27 کروز میزائل پھینکے گئے اور جنوب کے نو فلائی زون میں توسیع کی گئی اور عراق کے ریڈار سسٹم پر حملہ کر کے اُسے تباہ کر دیا گیا۔ 10 ستمبر کو پہلی مرتبہ ''تیل کے بدلے خوراک'' کے تحت تیل کی برآمد شروع ہوئی۔ اس معاہدے کے باوجود عراق میں خوراک اور ادویات کی قلت سے سالانہ لاکھوں انسانی جانیں ضائع ہوتی رہیں۔

1997ء۔ 13 نومبر کو عراق نے اقوام متحدہ کی مقرر کردہ معائنہ ٹیم کے امریکی ارکان کو فوری طور پر عراق سے نکل جانے کا حکم دیا۔ اس معائنہ ٹیم کا کام یہ یقین کرنا تھا کہ عراق نے تمام جوہری' کیمیاوی' حیاتیاتی اور بلاسٹک ہتھیار ضائع کر دیئے ہیں۔ 1991ء کی سیز فائر کی قرارداد کی رُو سے طے پایا تھا کہ جب تک عراق اپنا تمام تباہ کن اسلحہ ضائع نہیں کرے گا' اُس پر سے اقتصادی پابندیاں نہیں اٹھائی جائیں گی۔ عراق کے اس اقدام سے امریکہ کو مزید اشتعال پیدا ہوا اور اُس نے اقوام متحدہ پر عراق کے خلاف سخت کارروائی کے لئے دباؤ ڈالا۔

1998ء۔ 17 دسمبر کو امریکہ اور برطانیہ کی فوجوں نے ایک بار پھر عراق پر حملہ کر دیا جو چار دن تک جاری رہا۔ ان حملوں میں سینکڑوں میزائل اور بم استعمال ہوئے اور عراق کا بے حد جانی و مالی نقصان ہوا۔ روس' فرانس اور چین سمیت دنیا بھر میں اِن حملوں کی شدید مذمت کی گئی۔ روس نے تو امریکہ اور برطانیہ سے اپنے سفیر بھی واپس بلا لئے تھے' جو بعد میں واپس بھیج دیئے گئے۔ نیز روس نے نیٹو سے اپنے تعلقات پر نظر ثانی کی بھی دھمکی دی۔ تاہم اسلامی سربراہی کانفرنس اور عرب لیگ اور دوسرے بین الاقوامی ادارے کوئی مضبوط مؤقف اختیار نہ کر سکے۔

2001ء۔ گیارہ ستمبر کو امریکہ کے ''ورلڈ ٹریڈ سنٹر'' کے حیرت انگیز' خودکش حملے کے نتیجے میں انہدام کے بعد صدر بُش کا پیمانہ صبر واقعی بے قابو ہو گیا اور انہوں نے کہنا شروع کر دیا کہ عراق ''برائی کا محور'' ہے اور اس کی موجودہ حکومت اور صدام حسین کا فی الفور خاتمہ اور عراق پر پیشگی فوجی حملہ امریکہ کی سلامتی کے لئے بہت ضروری ہے۔ امریکہ کے بہت سے صحافیوں اور دانشوروں اور غیر ملکی نقادوں نے امریکہ کے اس جنگی جنون اور عراق کے خلاف لگائے گئے الزامات پر نکتہ چینی کی اور یہ رائے دی کہ مسائل کو سیاسی حکمت عملی اور ڈپلومیسی سے حل کرنا چاہئے۔ صدر بُش نے افغانستان کے ساتھ ساتھ عراق کو بھی دہشت گرد قرار دینے کی کوشش کی اور اُس کے تعلقات اسامہ بن لادن اور القاعدہ سے ثابت کرنے چاہے' لیکن ثابت نہ ہو سکے۔

2002ء۔ 12 ستمبر کو صدر بُش نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اگر سیکیورٹی کونسل نے اپنی ہی منظور کردہ قراردادوں (بشمول نمبر 1440) پر عراق سے فوراً عمل نہ کرایا تو امریکہ خود اپنی مرضی کے مطابق کارروائی کرے گا۔ صدر صدام نے عراقی اسلحے کے معائنے کی قرارداد غیر مشروط طور پر تسلیم کر لی۔ صدر بُش نے اعلان کیا کہ صدام چوہے بلی کا کھیل' کھیل رہا ہے اور ہمیں دھوکا دے رہا ہے۔

2003ء۔ جنوری نئے سال کی پہلی تاریخ کو عصیلے صدر جارج واکر بُش نے بڑے دھیمے اور نرم و ملائم لہجے میں پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ابھی تک عراق میں تباہی پھیلانے والے اسلحے کا ثبوت نہیں ملا ہے' لیکن 8 جنوری کو انہوں نے اس الزام کا اعادہ کیا کہ عراق کے پاس تباہ کن ہتھیاروں کے وسیع ذخائر ہیں۔ برطانیہ نے امریکہ کو یہ پیغام بھجوایا کہ امریکہ کو اپنی پالیسی کے خلاف دنیا کے تمام ممالک کی رائے کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے' لیکن دوسرے ہی دن اس نے ایٹمی اسلحے سے لیس اپنا بحری بیڑا خلیج کی طرف روانہ کر دیا' حالانکہ اقوام متحدہ کے چیف معائنہ کار ہینس بلکس نے اعلان کیا کہ انہیں ابھی تک عراق میں کچھ نہیں ملا ہے۔ دریں اثنا اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے غیر وابستہ ممالک کی یہ درخواست مان لی ہے کہ 27 جنوری کو اقوام متحدہ کے اسلحہ انسپکٹروں کی اپنی کارکردگی

کی رپورٹ کی مکمل سماعت کی جائے ..... 12 جنوری کو ایٹمی توانائی کی بین الاقوامی ایجنسی کے سربراہ ڈاکٹر محمد البرادی نے وثوق سے کہا کہ عراق کے پاس کوئی ایٹمی اسلحہ نہیں ہے۔ معائنہ کے لئے ایک سال چاہئے۔ سعودی عرب، ترکی، چین، ملائیشیا اور عرب لیگ نے عراق پر حملے کی مخالفت کردی۔ برطانیہ میں عراق پالیسی پر برسراقتدار لیبر پارٹی میں پھوٹ پڑنے لگی۔ صدر صدام حسین نے کہا کہ عراق کے صرف ہمسایہ ممالک ہی امریکی فوج کو اپنے اڈے نہ دے کر امریکی حملے کو روک سکتے ہیں۔ امریکہ نے سلامتی کونسل کے اجلاس میں کہا کہ موجودہ قرارداد نمبر 1441 بھی عراق کے خلاف فوجی کارروائی کے لئے کافی ہے۔ لیکن سلامتی کونسل نے 27 جنوری کو عراق پر فوجی حملے کے لئے امریکی دباؤ مسترد کردیا اور فیصلہ کیا کہ حملے کی تاریخ دو ماہ تک مؤخر کی جائے۔ فرانس اور جرمنی نے حملے کے خلاف بیان دیا۔ صدر صدام حسین نے ایک پُر جوش خطاب میں امریکہ کو متنبہ کیا کہ نئے ہلاکو خان کا حملہ امریکہ کی خودکشی ثابت ہوگا۔ لگتا ہے کہ یہودیوں نے امریکہ کو خودکشی پر مجبور کردیا ہے۔ 27 جنوری ہی کو چیف اسلحہ انسپکٹر ہینس بلکس اور ایٹمی توانائی کی عالمی ایجنسی کے سربراہ محمد البرادی کی جانب سے اعتراف کیا گیا کہ عراق نے اب تک تعاون کی پالیسی اپنا رکھی ہے۔ ہمیں جہاں جانا ہوتا ہے وہاں فوراً پہنچایا جاتا ہے۔ ہمیں اپنا کام کرنے کی سہولتیں حاصل ہیں۔ اس کے باوجود امریکہ نے اعلان کیا کہ ہمارا مؤقف سچ ثابت ہوگیا کہ عراق معائنہ کاروں سے تعاون نہیں کر رہا۔ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کوفی عنان، فرانس، چین اور رُوس نے کہا کہ معائنہ کار ٹیم کو مزید وقت دیا جانا چاہئے اور مسئلے کے حل کے لئے کوئی ڈیڈ لائن مقرر کر کے رکاوٹ نہیں ڈالنی چاہئے۔

فروری ۔ یکم فروری کو صدر بش نے امریکی افواج کو ضرورت پڑنے پر عراق کے خلاف ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے کا اختیار دے دیا۔ امریکہ اور برطانیہ 14 فروری کو سلامتی کونسل میں قرارداد پیش کریں گے جس میں صدر صدام حسین کو عراق چھوڑنے کے لئے 48 گھنٹے کا الٹی میٹم دیا جائے گا۔ اُسی روز فرانس اور جرمنی عراق میں ''امن فوج'' کی تعیناتی کا منصوبہ پیش کریں گے۔ اس منصوبے کی حمایت روس اور چین نے بھی کی ہے، لیکن امریکہ اور برطانیہ اب بھی عراق کے خلاف مسلح کارروائی کی کوشش کر رہے ہیں۔ صدر بش نے پھر دھمکی دی ہے کہ اگر سلامتی کونسل میں اُن کی نئی قرارداد کی مخالفت کی گئی تو اقوام متحدہ غیر متعلق اور بے فائدہ ہو جائے گی۔ اُدھر نیٹو (امریکی و یورپی مشترکہ فوجی اتحاد) کے رُکن ممالک فرانس، جرمنی اور بیلجیم نے عراق کے خلاف جنگ کے لئے امریکی حمایت کی

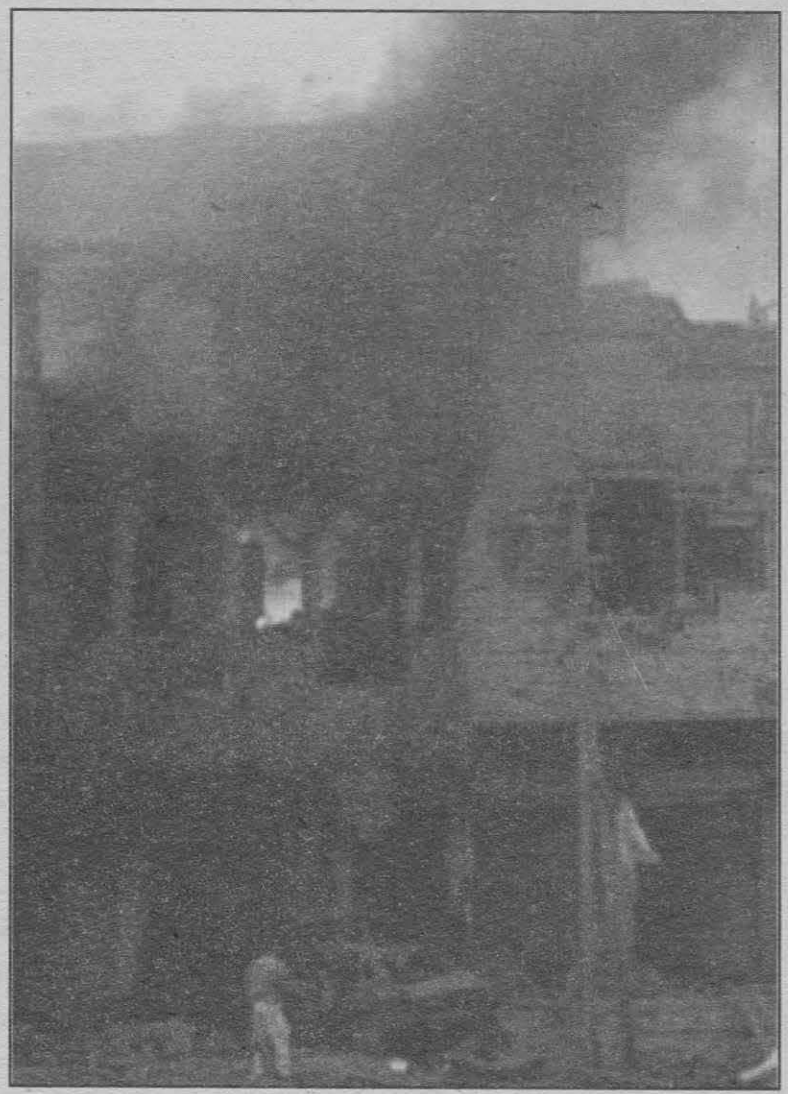

امن کے ٹھیکیداروں کی عراق پر بمباری سے شہری آبادی میں ہونے والی تباہی کا ایک ہلکا سا منظر

درخواست رد کردی ہے۔ امریکہ کے وزیر خارجہ کولن پاول نے اعلان کیا کہ جو ملک بھی نیٹو کے اجلاس میں امریکی درخواست کو ویٹو کرے گا، وہ ناقابل معافی جرم ہوگا۔ ملائیشیا کے وزیراعظم مہاتیر محمد نے عیدالاضحیٰ کے موقع پر مسلم ممالک کے سربراہوں کو تجویز پیش کی کہ وہ مسلم کرنسی جاری کریں، ڈالر سے تعلق ختم کریں۔ امریکی مصنوعات کا بائیکاٹ کریں۔ امریکی بینکوں کو دیوالیہ کریں۔ پھر امریکہ ایٹم بموں کے بدلے روٹی خریدے گا۔

فروری کے دوران میں پوری دنیا میں امریکہ کے جنگی عزائم کے خلاف ہر ملک میں جو احتجاجی مظاہرے ہو رہے تھے، وہ 15 فروری کو اپنے عروج پر پہنچ گئے۔ تاریخ انسانیت میں جنگ کے خلاف اتنا بڑا اور عالمگیر مظاہرہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا، جس میں ہر مذہب و نسل کے لوگوں نے سینکڑوں شہروں میں سوا کروڑ سے زائد افراد نے امریکہ کے جنگی عزائم کے خلاف امن کے حق میں عالمی اجتماعی آواز بلند کی۔ مظاہروں کا سلسلہ آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سے شروع ہو کر امریکہ تک پھیل گیا۔ لندن میں 20 لاکھ، برلن میں 5 لاکھ، پیرس میں ساڑھے تین لاکھ، دمشق میں دو لاکھ، ڈبلن میں ایک لاکھ، میڈرڈ میں 20 لاکھ، اٹلی میں 30 لاکھ افراد نے زبردست مظاہرے کئے، جن کو مبصرین نے تاریخ کے سب سے بڑے مظاہرے قرار دیا ہے۔ لندن میں ہونے والے مظاہرے میں صدر بش کا ایک ایسا پتلا بھی اٹھا رکھا تھا، جس کے پنجوں میں ایک گلوب تھا، جس کی چونچ میں ایک بچے کا بازو تھا۔ مظاہرین نے صدر بش اور برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کے ماسک بھی پہن رکھے تھے۔ مظاہرے میں ایک بینر بھی نمایاں تھا، جس پر لکھا تھا: ''ٹیکساس کے سارے بے وقوف واشنگٹن میں جمع ہیں''۔ صدر بش کا تعلق ٹیکساس سے ہے۔ بعض مظاہرین نے

اسامہ بن لادن کی تصویروں والے کپڑے پہن رکھے تھے۔

24فروری۔ ملائیشیا کے دارالحکومت کوالالمپور میں 116 غیر جانب دار ممالک کی کانفرنس منعقد ہوئی۔ ملائیشیا کے وزیراعظم مہاتیر محمد نے اس موقع پر ''بزنس فورم'' سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ شمالی کوریا نے دوٹوک الفاظ میں اعتراف کیا ہے کہ اُس کے پاس مہلک ہتھیار ہیں۔ اس کے باوجود امریکہ نے عراق کے مقابلے میں شمالی کوریا سے نرم رویہ اختیار کر رکھا ہے' جس سے واضح ہو گیا ہے کہ مغرب کی مہم ''بدمعاش'' قرار دیئے گئے ملکوں کے پاس خطرناک ہتھیاروں کی موجودگی کے خلاف نہیں' بلکہ مسلمانوں کے خلاف ہے۔

25فروری۔ ملائیشیا کے وزیراعظم مہاتیر محمد کی قیادت میں امریکی جارحیت کے خلاف دو لاکھ افراد کی ریلی ہوئی' جس میں آزاد فلسطینی ریاست کی حمایت' عراق پر پابندیوں کے خاتمے اور بحران کے پُرامن حل کے لئے دنیا بھر کے عوام کے نام یادداشت پیش کی گئی۔

26فروری: کوالالمپور میں غیر جانب دار ممالک کی تحریک (NAM) کی سربراہ کانفرنس کی طرف سے جاری ہونے والے علامیہ میں دہشت گردی کی آڑ میں ''نام'' کے کسی رُکن کے خلاف طاقت کے استعمال کو سختی سے ممنوع قرار دیا گیا۔ کہا گیا کہ جنگی جرائم میں ملوث اسرائیلیوں پر عالمی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔ عراق' ایران اور شمالی کوریا کو ''برائی کا محور'' قرار دینے کے امریکی اعلان کو سیاسی اور نفسیاتی دہشت گردی قرار دیا گیا۔

مارچ۔ یکم مارچ: عراق کے عوام سے اظہارِ یک جہتی کے لئے بحرین' مصر' ترکی اور پاکستان میں امریکی جارحیت کے خلاف لاکھوں افراد کے احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ عراق نے اعلان کیا ہے کہ وہ آج سے اپنے دور مار میزائل ''الصمود'' تباہ کر دے گا' جبکہ امریکہ نے عراق کے اس اعلان کو بھی مسترد کرتے ہوئے کہا کہ یہ فریب کاری ہے اور ہم صدام کو غیر مسلح ہونے پر مجبور کر دیں گے۔

2مارچ: شرم الشیخ (مصر) میں عرب لیگ نے عراق پر کسی حملے یا حملے میں کسی عرب ملک کے شریک ہونے کو مکمل طور پر مسترد کر دیا۔ امریکی مطالبے کے حوالے سے خطے میں کسی قسم کی تبدیلی مسلط کرنے کی کوششوں پر سخت تنقید کی گئی۔

10مارچ: امریکی جارحیت کے خلاف دنیا بھر میں عوامی مظاہروں کا سلسلہ جاری ہے۔ اٹلی' انڈونیشیا' جرمنی' فرانس' برطانیہ' بلغاریہ' چلی' آئرلینڈ اور ترکی میں بھی زبردست مظاہرے ہوئے۔

11مارچ: اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل کوفی عنان نے امریکہ کو خبردار کیا ہے کہ وہ سلامتی کونسل کی بے حرمتی نہ کرے۔ روس اور فرانس نے اعلان کیا ہے کہ وہ جنگ کے حق میں امریکہ کی نئی قرارداد کو ویٹو کر دیں گے۔ امریکہ نے کہا کہ روس اور فرانس کا یہ اقدام انتہائی مایوس کن ہوگا۔

17مارچ: پرتگال کے جزیرے ازورس میں امریکہ اور اُس کے دو اتحادی ممالک یعنی برطانیہ اور سپین نے عراقی بحران کے سفارتی حل کے لئے آج آخری دن قرار دیتے ہوئے صدر صدام حسین کو واضح الٹی میٹم دیا ہے کہ وہ اگر خود کو فوری اور غیر مشروط طور پر غیر مسلح نہ کریں گے تو جنگ ہوگی۔ امریکہ نے ترکی سے پندرہ ارب ڈالر کا امدادی پیکج واپس لے لیا اور اُسے جنگ کی دھمکی دے دی۔ امریکی وزیر خارجہ پاول نے کہا کہ اب ہمیں سلامتی کونسل میں جانے کی ضرورت نہیں' کیونکہ اختلافات اتنے گہرے ہیں کہ سلامتی کونسل کے مزید اجلاسوں کی ضرورت نہیں' لیکن روس' فرانس اور جرمنی نے سلامتی کونسل کا اجلاس بلانے کے لئے کہا ہے۔ صدر بش نے یہ بھی کہا کہ اگر سلامتی کونسل نے عراق کے خلاف جنگ کی قرارداد منظور نہ کی تو وہ اقوام متحدہ کی تشکیل نو کے لئے اقدامات کریں گے۔

18مارچ: امریکہ نے سلامتی کونسل میں قرارداد مسترد ہونے کے خطرے سے بچنے کے لئے اپنی وہ قرارداد واپس لے لی جس میں عراق کے خلاف مسلح فوجی کارروائی کے لئے کہا گیا تھا۔ امریکہ نے کہا کہ سلامتی کونسل اپنے امتحان میں فیل ہو گئی ہے۔ قرارداد نمبر 1441 ہمیں فوری کارروائی کا حق دیتی ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ کے قائد ایوان اور سابق وزیر خارجہ رابن ککس نے وزیراعظم ٹونی بلیئر کی عراق پالیسی کے خلاف بطور احتجاج استعفیٰ دے دیا۔ انہوں نے کہا کہ عالمی حمایت کے بغیر عراق کے خلاف جنگ میں شامل ہونے پر استعفیٰ دے رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ جنگ کو برطانوی عوام کی حمایت حاصل نہیں۔

20مارچ: امریکی الٹی میٹم کی مدت پاکستانی وقت کے مطابق آج جمعرات کو صبح نو بجے ختم ہو گئی۔ صدر بش نے

ہوش کرو!!

انور جمیل

مسلم پہ ستم ڈھانے کے لئے کافر کی حمایت' ہوش کرو!
بھائی کے لہو کی دشمن سے لیتے ہو قیمت' ہوش کرو!

آتی ہے مصیبت جب کوئی' اپنا ہی لہو کام آتا ہے
غیروں سے محبت ہے تم کو' اپنوں سے عداوت' ہوش کرو!

کردار کی عظمت چاک ہوئی' گفتار کی ہیبت خاک ہوئی
ہر بزم بنی ہے بزمِ ستم' ہر موڑ پہ ذلت' ہوش کرو!

تم کس کے حوالے کرتے ہو' بچوں' بہنوں' ماؤں کو؟
ان وحشی درندوں کے' کیا یہ ہے غیرت' ہوش کرو!

ظالم کو ظالم کہنا بھی' کیوں موت دکھائی دیتا ہے؟
کیا عشق و جنوں کے جذبے کی' اتنی ہے صداقت' ہوش کرو!

ہے عقل و خرد سے بیر تمہیں' انجام کا بھی احساس نہیں
باطل کی اطاعت پر نازاں' اللہ سے بغاوت' ہوش کرو!

مغرب کی ثقافت کے اتنے کیوں دیوانے پروانے ہو؟
جو دونوں جہاں کا ضامن ہے' اس دین سے غفلت' ہوش کرو!

تقدیر پرستی کے خوگر اور علم و عمل سے عاری ہو
اپنی تو ادائیں یاد نہیں' قسمت سے شکایت' ہوش کرو!

جو تمہارے لہو کے پیاسے ہیں' تم ان کو مسیحا کہتے ہو
خود انور اپنے ہاتھوں سے' یہ اپنی ہلاکت' ہوش کرو!

تازہ اور نیا اعلان کیا کہ اب صدام حسین عراق چھوڑ کر جائیں یا نہ جائیں' عراق پر حملہ ضرور کریں گے۔

20 مارچ کو امریکہ نے اپنے اتحادیوں کے ساتھ مل کر جدید ترین اسلحے کے ساتھ عراق پر زبردست حملہ کیا' 17 اپریل کو شہر بغداد میں امریکی ٹینکوں کے داخلے کے بعد یہ معرکہ ختم ہوا۔ اقوام متحدہ میں عراق کے سفیر نے 10 اپریل کو بڑے دُکھ کے ساتھ اعلان کیا کہ جنگ میں کسی کو فتح ہوتی ہے' کسی کو شکست اب کھیل ختم ہوا۔ معرکہ تو ختم ہوا ہے' لیکن جنگ ابھی جاری ہے اور ہمیشہ جاری رہے گی۔ امریکہ اخلاقی طور پر جنگ اُسی دن ہار گیا تھا جب اُس نے اپنے سے بیس گنا کم طاقت والے ملک کے خلاف' اپنے حواریوں کو ساتھ ملا کر جارحانہ حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ قانونی طور پر جنگ 18 مارچ کو ہار گیا تھا جب سلامتی کونسل میں اپنی قرارداد منظور نہ ہونے کے خوف سے اور پوری دنیا میں احتجاجی مظاہروں کے باوجود عراق پر جنگی کارروائی کا فیصلہ کیا۔ امریکہ کے سابق صدر جمی کارٹر' دنیا بھر کی قانونی انجمنیں اور اقوام متحدہ کے نمائندے بار بار اعلان کرتے رہے ہیں کہ عراق پر امریکہ اور برطانیہ کا حملہ قابضانہ' جارحانہ اور غیر منصفانہ' اور بین الاقوامی قانون کی سراسر خلاف ورزی ہے۔

امریکہ نے حملہ کیوں کیا؟

آخر امریکہ نے اپنے گلے میں رسوائی کا یہ طوق کیوں ڈالا ہے؟ جنگ کا اعلانیہ مقصد تو صرف یہی بتایا گیا تھا کہ صدام حسین کو معزول کیا جائے' کیونکہ انہوں نے تباہ کن اسلحہ ضائع کرنے کے بارے میں سلامتی کونسل کی قرارداد 687 اور 1441 پر عمل نہیں کیا۔ لیکن درپردہ بڑے مقاصد دو تھے۔ عظیم تر اسرائیل کا قیام اور تیل کی دولت پر قبضہ۔ ان دو مقاصد کی تشریح یوں ہے:

عظیم تر اسرائیل کا قیام

(صہیونیت کی تحریک' اسرائیل کے قیام اور عظیم تر اسرائیل کی پوری جزئیات وتفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو ''ندائے خلافت'' کا فلسطین نمبر) اس خصوصی نمبر میں امریکہ اور اسرائیل کے مشترکہ منصوبے کے مطابق عظیم تر اسرائیل کا نقشہ بھی دیا گیا ہے جس میں نہر سویز سمیت مصر کا بہت بڑا علاقہ' پورا صحرائے سینا' شام' لبنان' اردن' عراق' کویت' ترکی کا جنوبی حصہ اور سعودی عرب کا ایسا پورا علاقہ جس میں نجد وحجاز کے علاوہ مسلمانانِ عالم کا دوسرا بڑا شہر مدینہ منورہ بھی شامل ہے۔

14 مارچ کو جنگ شروع ہونے سے چند روز قبل صدر بش نے اپنے ''عرب حواریوں'' کو نفسیاتی طور پر خوش کرنے کے لئے یکایک یہ اعلان کیا تھا کہ وہ عنقریب

ایک عراقی عورت حسرت ویاس کی تصویر بنی عراق کی آزادی کا منظر دیکھ رہی ہے

فلسطینی ریاست کے قیام کے لئے ''روڈ میپ'' کا اعلان کرنے والے ہیں۔

19 مارچ کو اسرائیلی وزیراعظم شیرون نے ایک اخباری بیان میں کہا کہ ''ہر جگہ طاقت کا استعمال'' امریکہ اور اسرائیل کی مشترکہ پالیسی ہے۔ اسرائیل بلیک میلنگ کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکے گا' جو ہمیں ختم کرنے کی کوشش کرے گا' ہم آگے بڑھ کر اُس کا قلع قمع کر دیں گے۔ ہم پہلے بھی ثابت کر چکے ہیں کہ بدی کے لئے کوئی پناہ گاہ ہے نہ ہوگی''۔

25 مارچ کو جنگ شروع ہونے کے پانچویں دن اسرائیل کے وزیراعظم شیرون نے اعلان کیا کہ اب چند روز ہی کی بات ہے کہ عراق کے پٹرول کی صفائی اسرائیل کے تیل صاف کرنے کے کارخانوں میں ہوا کرے گی۔ اس پر صدر بش نے شیرون کو فون کر کے اظہارِ ناراضگی کیا تھا کہ انہوں نے قبل از وقت منصوبے کا انکشاف کر کے غلطی کی ہے۔

10 اپریل' شمالی آئرلینڈ کے دارالحکومت بلفاسٹ میں صدر بش اور برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کے مذاکرات کے بعد پریس کانفرنس میں صدر بش نے اعلان کیا کہ عراق کے بعد اب وہ فلسطین کے روڈ میپ پر توجہ دیں گے۔ اُسی روز اسرائیل کی طرف سے سرکاری طور پر فلسطینیوں اور عربوں سے کہا گیا کہ سقوطِ عراق سے انہیں سبق حاصل کرنا چاہئے اور صحیح نتائج اخذ کرنے چاہئیں۔ آج عراق کے عوام اپنے ملک کی بدترین آمریت سے چھٹکارا پانے کے بعد امریکہ اور برطانیہ کی فوجوں کا والہانہ استقبال کر رہے ہیں' ہم اپنے فلسطینی پڑوسیوں سے امید کرتے ہیں کہ وہ بھی ہمارے ساتھ امن وامان سے رہنے کو ترجیح دیں گے۔

13 اپریل۔ اسرائیل نے امریکہ کے دیئے ہوئے اُس ''روڈ میپ'' کے منصوبے میں 15 ترامیم اور تبدیلیوں کی سفارش کی ہے جس کے مطابق 2005ء میں آزاد فلسطین کی ریاست قائم کی جائے گی۔ مجوزہ تبدیلیوں میں سب سے ضروری شق فلسطینی مہاجرین سے متعلق ہے۔ اقوام متحدہ کی متعلقہ ایجنسی کے مطابق 30 لاکھ 90 ہزار فلسطینی مہاجرین کی باقاعدہ رجسٹریشن موجود ہے' جن میں سے زیادہ تر مغربی کنارہ' غزہ' اردن' لبنان اور شام میں رہ رہے ہیں۔ اسرائیل کا کہنا ہے کہ اگر مجوزہ روڈ میپ کے مطابق فلسطینی مہاجرین واپس لائے گئے تو یہ اسرائیل کے لئے خودکشی کے برابر ہو گا جس کی اپنی موجودہ آبادی 50 لاکھ 80 ہزار ہے۔ 13 اپریل ہی کو روزنامہ واشنگٹن پوسٹ میں معروف صحافی اور تجزیہ نگار جم لوب نے اپنے ایک خصوصی مضمون میں لکھا: ''عراق کی فتح کے بعد اب یہ صاف نظر آ رہا ہے کہ جیسا صدر بش نے بلفاسٹ میں اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ وہ اب فلسطین کے روڈ میپ پر زیادہ توجہ دیں گے' وہ فلسطین کے امن منصوبے کی بجائے شام کے خلاف جنگ پر زیادہ توجہ دیں گے۔''

گیارہ ستمبر 2001ء کو امریکہ کے ''ورلڈ ٹریڈ سنٹر'' کے انہدام سے یہودیوں کے خفیہ عزائم طشت از بام ہو گئے ہیں۔ اگرچہ انہیں یہ نقصان بھی پہنچا ہے کہ اُن کے ''عظیم تر اسرائیل'' کے صدیوں پرانے خواب کو امریکہ نے عملی شکل دینے کے لئے بڑی ہوشیاری اور مفاد پرستی سے ''نیو ورلڈ آرڈر'' کا حصہ بنا لیا ہے۔ اب متعدد شہادتوں اور ثبوتوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ''ورلڈ ٹریڈ سنٹر'' خود یہودیوں نے تباہ کرایا تھا' تاکہ امریکی حکومت کو مشرق وسطیٰ

میں مشغول کیا جا سکے۔ اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس تعمیراتی یہودی کمپنی کو "ورلڈ ٹریڈ سنٹر" تعمیر کرنے کا ٹھیکہ دیا گیا تھا' اُسی کمپنی کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا ملبہ اٹھانے کا بھی ٹھیکہ دیا گیا۔ تعمیر کرنے کا جو خرچہ تھا اُس سے زیادہ ملبہ اٹھانے کا خرچہ آیا ہے۔ افغانستان کے بعد عراق پر عملاً قابض ہونے کے بعد وسط ایشیائی اسلامی ملکوں کے تیل اور گیس کی اجارہ داری حاصل کرنا بھی امریکہ اور اسرائیل کا ایک پرانا خواب ہے' جس کے شرمندۂ تعبیر ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔

تیل کے ذخائر پر قبضہ: حالیہ جنگ مذہبوں کی جنگ ہے نہ تہذیبوں کی جنگ' بنیادی طور پر یہ مفادات کی جنگ ہے۔ 112 ارب بیرل تیل کے یقینی اور 215 ارب تیل کے تخمینی ذخائر رکھنے والا عراق' جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جب دنیا سے تیل ختم ہو گا تو آخری قطرہ عراق ہی سے نکلے گا۔ یہی وجہ ہے کہ روزانہ 20 ملین بیرل تیل استعمال کرنے والا امریکہ' جو کہ دنیا میں تیل کا سب سے بڑا صارف ہے' اُس کی خواہش ہے کہ تیل پیدا کرنے والے خطے پر اپنا قبضہ جما کر وہاں کے تیل کے ذخائر پر اپنی اجارہ داری قائم کر سکے۔ جنگ شروع کرنے سے تین روز قبل امریکی وزیرِ تجارت نے جنگ کا ایک مقصد یہ بھی بتایا تھا کہ "جنگ سے عراقی تیل کا وہ نل کھل جائے گا جس سے عالمی معیشت کی کارکردگی پر بہتری کے اثرات مرتب ہوں گے' خاص طور پر اُن ممالک پر جو صنعتی پیداوار اور تیل کے صارف ہیں"۔

1991ء کی خلیجی جنگ کے بعد سے لے کر اب تک امریکی تیل کی پیداوار میں تقریباً 20 فیصد کمی آئی ہے جبکہ آنے والے دس برسوں میں دنیا کے تیل کی ضروریات میں 40 فیصد تک اضافہ ہو جائے گا۔ بدترین حالات کے باوجود امریکہ روزانہ ایک ملین بیرل تیل عراق سے برآمد کرتا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ عراقی کنوؤں سے حاصل ہونے والا تیل نہ صرف انتہائی کم لاگت پر نکالا جا سکتا ہے بلکہ میٹھا کروڈ ہونے کے باعث صاف بھی آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

دنیا بھر کے تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنے کے لئے امریکہ کے اندر پیدا ہونے والے جنگی جنون کی ایک وجہ تیل کی کھپت میں اضافہ اور ذخائر میں بتدریج کمی ہے' وہاں دوسری وجہ یہ ہے کہ امریکی مقتدر لوگ اور عہدے دار آئل کمپنیوں کے مالک بھی ہیں جن میں سینئر بش' ڈک چینی اور کنڈولیزا رائس سمیت کئی دیگر اہم سیاسی شخصیات بھی ہیں۔ سینئر بش کے بارے میں تو کہا جاتا ہے کہ اُس کے اسامہ بن لادن کے ساتھ کارلائل گروپ کے حوالے سے قریبی تعلقات رہے ہیں۔ یہ تعلقات اُس وقت کشیدہ ہوئے جب امریکہ چاہتا تھا کہ بحیرۂ کیسپئن سے گزارنے والی پائپ لائن کا ٹھیکا امریکی آئل کمپنی Unocal کو دیا جائے جبکہ اسامہ کا اصرار تھا کہ اس کا ٹھیکہ ارجنٹائن کی آئل کمپنی Baridas کو دیا جائے۔ یاد رہے کہ امریکی کمپنی کے مشیر ہنری کسنجر اور پاکستان میں سابق امریکی سفیر رابرٹ اوکلے ہیں۔ اسامہ بن لادن سے سینئر بش کے تعلقات میں مزید کشیدگی اُس وقت پیدا ہوئی جب مشرقی افریقہ میں امریکی سفارت خانوں پر بم دھماکوں کا الزام القاعدہ تنظیم پر لگایا گیا جس کی پشت پناہی اسامہ کر رہے تھے۔

عراق میں امریکہ اور برطانیہ کے مفادات کو اُس وقت شدید دھچکا لگا تھا جب 1972ء میں عراقی پٹرولیم کمپنی کو قومی تحویل میں لے لیا گیا تھا اور یوں اس کمپنی کی حصہ دار دو امریکی اور دو برطانوی آئل کمپنیوں کو اپنے مفادات اور بہت بڑے کاروبار سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ 1991ء کی خلیجی جنگ کے نتیجے میں امریکہ نے خلیج کے بیشتر ممالک میں اُن مقامات پر اپنے فوجی اڈے بنا لئے جہاں پر وہ اپنے طیاروں کی چند منٹ کی پرواز سے تیل سپلائی کرنے والے اس واحد بحری راستے پر اپنی کارروائی کر سکتا ہے۔ تاہم اس خطے میں امریکی عزائم کی راہ میں حائل واحد ملک عراق ہی رہا ہے جو کہ صدام حسین کی موجودگی میں امریکہ کے مذموم مقاصد کے حصول میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کی تیل کی اجارہ دار کمپنیاں عراقی تیل کے نفع بخش ٹھیکوں سے محروم ہیں' جبکہ چین' انڈونیشیا اور انڈیا کو صدام حسین نے نفع بخش معاہدوں کی پیش کی ہوئی ہے اور اس کے علاوہ روس اور فرانس نے عراق کے ساتھ تیل کے کئی معاہدوں پر دستخط کئے ہوئے ہیں اور ان ممالک کو یہ خدشہ ہے کہ عراق میں صدام کی معزولی اور امریکی مداخلت کے باعث انہیں ان ٹھیکوں اور پراجیکٹ سے ہاتھ دھونا پڑیں گے جو کہ انہوں نے عراقی تیل تلاش کرنے اور نکالنے کے حوالے سے صدام حسین سے کر رکھے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ کو روکنے کے لئے ان ممالک نے بھرپور طریقہ سے امریکہ کی مخالفت کی اور فرانس نے تو امریکہ' برطانیہ اور سپین کی جانب سے سلامتی کونسل میں پیش کی جانے والی قرارداد کو ویٹو کر دینے کی دھمکی دی جس کی بنا پر ووٹنگ کرانے سے قبل ہی اس قرارداد کو واپس لے لیا گیا اور سلامتی کونسل کی منظوری کے بغیر ہی امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے عراق پر حملہ کر دیا۔

اصل میں سوویت یونین کی تحلیل کے بعد امریکہ واحد سپر پاور ہے جس کی بے پناہ طاقت کو چیلنج کرنے کی صلاحیت سردست کسی بھی ملک میں نہیں ہے۔ روس کے پاس تیل تو ہے لیکن معیشت کا انحصار تیل کی آمدنی پر بہت بڑھ چکا ہے۔ جبکہ امریکہ عراقی تیل پر قبضے کے بعد جب بھی چاہے گا' تیل کے نرخ کم کر کے روسی تیل کی منڈی خراب کر دے گا۔ جہاں تک تیل اور گیس کے وسیع ذخائر رکھنے والے عرب ممالک کا تعلق ہے تو وہ سب مل کر امریکہ کی معاشی' عسکری اور جدید ٹیکنالوجی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جہاں تک چین کا تعلق ہے تو وہ عراق کے ساتھ چین کے آزادانہ معاہدوں اور آنے والے دو تین عشروں میں معاشی طور پر ایک بہت بڑی طاقت بننے کے خدشات سے امریکہ بخوبی آگاہ ہے۔ تاہم فی الحال نہ تو امریکہ مشرقی ایشیا میں چینی اثر و نفوذ کے علاقوں میں کوئی مداخلت کرنا چاہتا ہے اور نہ چین ہی مشرقِ وسطیٰ اور وسط ایشیائی ملکوں میں امریکہ سے

ظفر اقبال

مردہ باد امریکہ

روز کرے شہری آبادی پر بیداد امریکہ
بربادی لانے سے ہو گا خود برباد امریکہ
مار پڑے گی کچھ ایسی' رکھے گا یاد امریکہ
کرتا پھرے گا دنیا کے آگے فریاد امریکہ
اپنے آپ سے عبرت پکڑے گا جلاد امریکہ
مردہ باد امریکہ

بم بارود سے اُدھڑے' امریکی میموں کے پُوت
لے کر واشنگٹن اترے اور جب روز نئے تابوت
تب اترے گا سر سے اس کے جنگ و جدل کا بھوت
اور پچھتائے گا' یہ میں کیا کر بیٹھا کرتُوت
سوچے گا' لیکن سب کچھ کرنے کے بعد امریکہ
مردہ باد امریکہ

سستا مال کمانے نکلے' رنگ برنگ نکھٹو
کوئی ریال کا گرویدہ اور کوئی تیل پہ لٹو
کسی پہ داغا توپ طمنچہ' کسی پہ ڈالا پٹو
اک دن بگٹٹ بھاگیں گے' بھاڑے کے یہ سب ٹٹو
نامراد یہ سارے ہوں گے اور ناشاد امریکہ
مردہ باد امریکہ

اپنے صاحب لیک طرف ہیں' بندے لیک طرف ہیں
اچھے' سچے ایک سمت میں' گندے ایک طرف ہیں
پاؤں میں پڑے ہوئے لداد کے پھندے لیک طرف ہیں
لیک ہی نعرہ مارتے' ٹور سمندے لیک طرف ہیں
مردہ باد امریکہ

دشمنی مول لینے کے حق میں ہے۔

اگر امریکہ کا کوئی مقابلہ کرسکتا ہے تو وہ یورپ ہے جو صنعتی اور اقتصادی طور پر بہت مستحکم ہے۔ لیکن امریکہ نے برطانیہ اور سپین کو اپنے ساتھ ملا کر ایک نئے گروپ کی شکل میں فرانس اور جرمنی کی قیادت میں یورپی وحدت کو توڑنے میں کامیاب رہا ہے اور ''یورپی یونین'' موجودہ خلیجی جنگ کے نتیجے میں امریکہ کے مخالف اور حامی دو متحارب گروپوں میں تقسیم ہو چکا ہے' لہٰذا عراق کے تیل کے ذخائر پر قبضے کے بعد امریکہ کی کوشش یہی ہوگی کہ روس اور بالخصوص فرانس کی وہ کمپنیاں جنہوں نے عراق میں تیل تلاش کرنے اور نکالنے کے ٹھیکے لئے ہوئے ہیں' انہیں منسوخ کر کے ان کی جگہ پر امریکی کمپنیوں کو ٹھیکے دیئے جائیں' تاکہ گیس' تیل اور توانائی کے تمام وسائل و ذخائر پر قبضہ کر کے روس' فرانس اور چین جیسی طاقتوں کی جانب سے مستقبل کے معاشی خطرات سے بچا جا سکے' کیونکہ ان تمام ملکوں کی طاقت کا انحصار توانائی پر ہے۔

ڈالر اور یورو کی باہمی جنگ

امریکہ اور یورپ کی جنگ کو خالص معاشی اصطلاح میں ڈالر اور یورو کی جنگ کہا جا سکتا ہے جو کرنسی کی اس جنگ میں جیتے گا' وہی دنیا پر راج کرے گا۔

1971ء کے معاہدۂ اوپیک کے بعد تیل کی تمام عالمی تجارت ڈالر میں ہونے لگی' لہٰذا جلد ہی ڈالر سب سے اہم اور ناگزیر عالمی تجارتی کرنسی بن گیا۔ اقوام عالم کو دراصل تجارت کے لئے عالمی کرنسی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس موافق صورت حال سے امریکہ خوب پھلا پھولا' کیونکہ منافع بخش تجارت کا وزن اس کے پلڑے میں تھا۔ اب تیل کے خریدنے کے لئے ہر ملک کے پاس لازماً ڈالر ہونے چاہئیں اور اسی لئے بین الاقوامی تجارت میں رائج الوقت سکہ ڈالر ہے۔ یوں امریکہ کے بھاگ لگ گئے اور وہ تین عشروں میں دنیا کی عظیم ترین معاشی و عسکری طاقت بن گیا۔

اس وقت معاشی طور پر ''یورپی یونین'' امریکہ کا معاشی مقابلہ کرنے کے لئے آگے بڑھی ہے اور اس نے عالمی منڈیوں میں ڈالر کو چیلنج کرنے کے لئے اپنی نئی کرنسی ''یورو'' تخلیق کی ہے لیکن تمام یورپی ممالک اس نئی کرنسی پر متفق نہیں ہیں' خصوصاً برطانیہ اس میں بہت کیڑے نکالتا ہے تاہم یورو کی ترقی کا دروازہ 2000ء میں اس وقت کھلا جب عراق نے اعلان کیا کہ وہ اپنے تیل کی عالمی تجارت یورو میں کرے گا۔ اس فیصلے سے یورو کو پَر لگ گئے اور اس کے مقابلے میں ڈالر کی قیمت رفتہ رفتہ بیس فیصد تک گر گئی۔

یہ صورت حال دیکھ کر امریکہ کے مخالف ممالک یورو کو اپنا نجات دہندہ مسیحا سمجھنے لگے۔ ایران اور وینزویلا میں خصوصاً ڈالر کی بجائے یورو کو تجارتی کرنسی بنانے پر سنجیدگی سے غور و خوض ہوا۔ ان کی دیکھا دیکھی روس بھی یورو کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ یورو کی شہرت سے امریکہ حسد کرنے لگا اور اس کی تجارتی کمپنیوں میں کھلبلی مچ گئی۔ انہیں یہ جنگل کی ایسی آگ محسوس ہوئی جو امریکہ کی پہلے سے کھوکھلی معیشت کو چند برسوں کے اندر اندر جلا کر بھسم کر سکتی ہے۔

آج امریکی ڈالر بے شک عالمی کرنسی ہے' مگر اس کی حیثیت ہوا بھرے غبارے سے زیادہ نہیں' کیونکہ جب اس کی مانگ بڑھی تو امریکہ کے پرنٹنگ پریس اسے دھڑا دھڑ چھاپنے لگے' مگر ڈالر مضبوط اس لئے ہے کہ عالمی کرنسی ہے' ورنہ حقیقت یہ ہے کہ امریکی حکومتوں کی غلط پالیسیوں کے سبب قرضے اتنے زیادہ ہو گئے ہیں کہ آج امریکہ دنیا کا سب سے بڑا مقروض ملک ہے۔ امریکہ میں ہر بچہ پیدا ہوتے ہی بارہ ہزار ڈالر کا مقروض ہو جاتا ہے۔

گویا یہ ارجنٹائن سے بھی زیادہ سنگین اور نازک معاشی صورت حال ہے' جہاں پچھلے دنوں دگرگوں اقتصادی صورت حال کے باعث زبردست عوامی مظاہرے اور ہنگامے ہوئے تھے۔

تیل پیدا کرنے والے یعنی اوپیک ممالک نے اگرچہ یورو کرنسی کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا' مگر امریکیوں کو دھڑکا لگ گیا کہ اگر تیل کی تجارت کا تھوڑا سا حصہ بھی یورو لے گیا تو فوراً تین بم امریکہ کی اقتصادیات کو تباہ و برباد کر دیں گے:۔

(1) یورپی ممالک ''یوروزون'' بنانے کی جانب راغب ہو جائیں گے۔ یوں یورو مزید مضبوط ہوگا اور جلد یا بدیر تیل پیدا کرنے والے ممالک سمیت' سب ممالک ڈالر کی بجائے یورو کو عالمی تجارتی کرنسی بنا لیں گے۔

(2) ڈالر دوسرے ملکوں سے امریکہ واپس آنے لگیں گے' جن کی وقعت اب ردّی جیسی ہوگی۔ یوں ملک میں اتنا افراط زر بڑھے گا کہ معیشت کا بیڑا غرق ہونا لازمی ہے۔

(3) عالمی مالیاتی منڈیوں میں افراتفری پھیلے گی اور دیکھتے ہی دیکھتے امریکی ڈالر کی قیمت عرش سے گر کر فرش تک جا پہنچے گی۔

اس خوفناک امنڈتے طوفان کو بھانپ کر امریکیوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جب صدام حسین نے عراقی تیل کی خرید و فروخت کے لئے یورو کو اپنایا تو آخر کار امریکیوں کو وہ سنہری موقع مل گیا جس کی وہ تمنا کرتے تھے۔ بظاہر امریکہ نے چراغ پا ہو کر اپنے پلے پلائے پٹھے کو سبق سکھانے کا اعلان کیا' مگر حقیقتاً وہ ایک تیر سے کئی شکار کرنا چاہتا تھا۔

امریکہ میں تیل کے کنویں بہت کم ہیں اور انہیں بھی نازک وقت کی خاطر بند کر دیا گیا ہے۔ امریکی اقتصادیات تیل پر انحصار کرتی ہے' لہٰذا انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہر قیمت پر عراق کو نشانہ بنایا جائے' تاکہ ایک تو عراقی تیل کی لازوال دولت ان کے ہاتھ آئے' دوسرے یورو کی فاتحانہ پیش قدمی کو روکا جا سکے۔ عراق پر فوجی قبضے کے بعد یہ منصوبہ عملی جامہ پہن چکا ہے' جس سے امریکہ کو درج ذیل فوائد حاصل ہوں گے:۔

(1) امریکہ دنیا کی سب سے طاقتور معاشی اور فوجی قوت بن کر ابھرے گا۔

(2) عراقی تیل کی خرید و فروخت بذریعہ ڈالر ہوگی اس وجہ سے بھی ڈالر سب سے برتر عالمی کرنسی رہے گا۔

(3) امریکہ کو اپنی ضرورت کے لئے بلکہ برآمد کے لئے عراقی کنوؤں سے وافر تیل بآسانی ملے گا۔

(4) امریکہ عراق میں وسیع فوجی اڈے بنا کر نہ صرف ہمسایہ ممالک بلکہ یورپ تک کو دباؤ میں رکھے گا اور تیل کی دولت سے مالا مال مشرق وسطیٰ پر حکمرانی کرے گا۔

(5) یورپی یونین اور یورو کی بڑھوتری متاثر ہوگی جو امریکہ اور اس کی ڈالر کو چیلنج کرنے والی واحد طاقت ہے۔

(6) اسرائیل مزید مضبوط ہوگا جس کی سیاست و معیشت مجاہدین کے حملوں سے کانپتی رہتی ہے۔

(7) اس امریکی مالیخولیا کی تسکین ہوگی کہ وہ وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی سے جنگ کرتا رہے' تاکہ وہ اپنے خوفناک ہتھیاروں کا امتحان لیتا رہے' ہتھیاروں کی تجارت ہوتی رہے' امریکی اسلحہ ساز صنعتوں کو فروغ ہو اور وہ زیادہ خوفناک ہتھیار بنا سکیں۔

امریکہ اس وقت دنیا کی مطلق العنان طاقت بننے کے لئے بڑی بے شرمی اور ڈھٹائی سے خون چوسنے والے اپنے آکٹوپس بازو پھیلا رہا ہے۔ اگر عالمی امریکی سلطنت کی راہ میں ہزاروں بے گناہ عراقی شہید ہو جائیں تو اسے کوئی پرواہ نہیں۔ مگر عالمی چودھری بننے کا خواب دیکھنے والوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ آخری فتح ہمیشہ حق کو ہوتی ہے۔

اب کس کی باری ہے؟

عظیم تر اسرائیل' تیل کے عالمی ذخائر پر تسلط اور ڈالر کے استحکام کی خاطر عراق پر فوجی قبضہ کر لینے کے بعد امریکہ کے سامراجی عزائم کا اگلا ہدف کیا ہے' جسے عالمی اخبارات اس شہ سرخیوں کے ساتھ چھاپتے ہیں کہ اب کس کی باری ہے؟

عراق کی حد تک تو امریکہ کو اپنی شاطرانہ چالیں چلنے میں بارہ برس (1991ء تا 2003ء) لگ گئے' لیکن اب جبکہ اس کا پورا لاؤ لشکر خطے میں براجمان ہوا ہے' خطے کے

دیگر ملکوں کو ہڑپ کرنا آسان دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ کسی قسم کی شاطرانہ چال چلنے کی بجائے اس نے اپنا اصل چہرہ دکھا دیا ہے۔

29 مارچ: ابھی عراق کی جنگ چھڑے دسواں دن تھا کہ امریکہ کے وزیر دفاع رمزفیلڈ نے شام اور ایران کو سخت وارننگ دی ہے کہ وہ عراق کی مدد سے باز آ جائیں۔ انہوں نے کہا شام سمندر کے راستے عراق کو فوجی ساز و سامان فراہم کر رہا ہے جن میں اندھیرے میں دیکھنے والی عینکیں بھی شامل ہیں' جبکہ ایران کے سینکڑوں انقلابی گارڈز عراق کی طرف سے لڑ رہے ہیں۔

13 اپریل: جنگ جاری ہے۔ امریکہ محکمہ دفاع پینٹاگون کے مشیر رچرڈ پرل نے شام کو خبردار کیا کہ اگر اس نے عراقی تباہ کن ہتھیاروں کو چھپا رکھا ہے تو وہ ہماری فوجی کارروائی کا اگلا ہدف ہوگا۔ شام کے پاس کچھ ہے تو ہمارے حوالے کر دے۔ ہم نہیں چاہتے کہ کوئی ہماری حکم عدولی کرے۔ شام' ایران' لیبیا اور شمالی کوریا جان لیں کہ امریکہ اپنے تحفظ کے لئے کوئی قدم اٹھانے سے گریز نہیں کرے گا۔ امریکہ کے ایسے دھمکی آمیز بیانات پر روس کے صدر پوٹن' فرانس کے صدر شیراک اور جرمنی کے چانسلر شروڈر نے امریکہ کو خبردار کیا ہے

14 اپریل: امریکی حکومت کے کسی وزیر یا عہدے دار نے نہیں' بلکہ اس کے صدر بش نے برملا کہہ دیا کہ "شام کے پاس کیمیائی ہتھیار ہیں' اسے ہر صورت میں تعاون کرنا ہوگا"۔ شام نے کہا: "الزامات غلط اور جھوٹے ہیں۔ اقوام متحدہ کے انسپکٹروں سے معائنہ کرا لیا جائے"۔

15 اپریل: امریکہ مزید آگے بڑھا۔ اس نے شام کو دہشت گرد ملک قرار دیتے ہوئے واضح الفاظ میں دھمکی دی ہے کہ وہ صدام حکومت کے اہل کاروں' بعث پارٹی کے کارکنوں کی مدد' دہشت گردی کی حمایت اور وسیع تباہی کے ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش پر اس کے خلاف اقتصادی' سفارتی اور دیگر پابندیاں لگانے پر غور کرے گا"۔ اس بیان کو مزید تقویت دینے کے لئے امریکی وزیر خارجہ کولن پاول نے بڑے متکبرانہ لہجے میں شام کے علاوہ دوسرے عرب اور اسلامی ملکوں کو بھی وارننگ دی ہے کہ "اب صورت حال بدل گئی ہے۔ اب خطے کے تمام ملک اپنے سابقہ اقدامات اور رویئے پر نظر ثانی کریں۔"

گویا اب انسانیت کو سب سے بڑے خوفزدہ کرنے والے خوفناک سوال کا جواب کھل کر سامنے آ گیا ہے کہ اب باری شام کی ہے۔ شام کے بعد کس کی باری آئے گی؟ ایران کی۔ ایران کے بعد کس کی باری آئے گی؟ افغانستان کی نہیں۔ افغانستان ان کی جھولی میں ہے بلکہ پاکستان کی۔ کیونکہ پاکستان کے مشرق میں امریکہ واجپائی کی شکل میں پہلے سے موجود ہے۔ یہودی اور ہندو کی ملی بھگت اور ان کے درمیان پچاس سالوں سے جو چالیں چل رہی ہے' اب تکمیل کا خاتمہ جلدی چاہتی ہیں۔

بالآخر خاتمہ کیونکر ہوگا؟

کسی بھی جنگ کا خاتمہ محض فوجی فتح مندی سے نہیں ہوتا۔ فوجی فتح کے ساتھ ساتھ روحانی اور اخلاقی فتح کا ہونا بھی ضروری ہے۔ ہلاکو خان نے جب بغداد پر قبضہ کیا تو اخلاق و ضمیر اس کے ساتھ نہ تھا' چنانچہ کچھ ہی عرصے بعد اس کی پوری قوم نے اخلاق و ضمیر پر عمل کرتے ہوئے اسلام قبول کر لیا۔

امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی اس جنگ جوئی کا بالآخر انجام کیا ہوگا؟ یہ عصر حاضر کا بہت بڑا' بلکہ سب سے بڑا سوال ہے' جس کا جواب آج سے گیارہ بارہ برس پہلے محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی فکر انگیز تالیف "سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی' حال اور مستقبل" میں دے رکھا ہے۔ اس کتاب کے مندرجات نہ صرف یہ کہ آج کے حالات میں بھی تر و تازہ ہیں' بلکہ ان کی معنویت عراق پر امریکی قبضے کے بعد زیادہ اجاگر ہو کر سامنے آ گئی ہے۔ اس کتاب کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو اس سوال کا حتمی و شافی و کافی جواب ہے کہ بالآخر ان ساری لاقانونی' بے ضمیری اور جنگی کارروائیوں کا خاتمہ کیونکر ہوگا؟ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب لکھتے ہیں:۔

> "قصہ مختصر' ایک عظیم "صلیبی جنگ" کے لئے میدان تیزی کے ساتھ ہموار ہو رہا ہے جو احادیث نبویہ کے مطابق بہت طویل ہوگی اور جس کے کئی مراحل ہوں گے جن کی تفصیل یہاں ممکن نہیں' البتہ ایک بات کا تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کے دوران ایک جنگ جسے "الملحمة العظمیٰ" قرار دیا گیا ہے' نہایت عظیم اور حد درجہ خوفناک ہوگی۔
>
> احادیث میں وارد شدہ تفاصیل سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان جنگوں کے دوران شدید جانی و مالی نقصانات کی صورت میں امت مسلمہ کے افضل اور برتر حصے یعنی مسلمانانِ عرب کو ان کے اس اجتماعی جرم کی بھرپور سزا مل جائے گی' جس کا ارتکاب انہوں نے دینِ حق کے نظام عدل وقسط کو ایک کامل نظامِ زندگی کی صورت میں قائم نہ کر کے کیا ہے۔
>
> ان جنگوں میں ایک مرحلے پر "دار السلام" صرف حجاز تک محدود ہو کر رہ جائے گا اور دشمن مدینہ منورہ کے دروازوں تک پہنچ جائے گا' لیکن پھر رحمتِ خداوندی جوش میں آئے گی' مسلمانانِ عرب ایک نئی ہیئت اجتماعی تشکیل دیں گے اور ایک نئے قائد و امیر محمد ابن عبداللہ المہدی کے ہاتھ پر "بیعت" کر کے جوابی کارروائی کے لئے مستعد ہو جائیں گے۔
>
> اس موقع پر یہ تذکرہ یقیناً دلچسپی کا موجب ہوگا کہ عیسائیوں کی روایات میں بھی اس دنیا کے خاتمے سے قبل ایک عظیم جنگ (Armageddon) کا ذکر موجود ہے جو حق اور باطل کے مابین ہوگی۔ چنانچہ حضرت یوحنا کے "مکاشفات" میں نہ صرف یہ کہ اس جنگ کا ذکر بھی موجود ہے' بلکہ یہ صراحت بھی ہے کہ اس میں حصہ لینے کے لئے "مشرق کے بادشاہوں کی فوجیں" بھی آئیں گی۔ "مکاشفات" میں اس جنگ کے دن کو "خدائے اعظم و قادر کا دن" کہا گیا ہے اور اس کے محل وقوع کا نام ہرمجدون یا آرمیگاڈان بتایا گیا ہے (دیکھئے مکاشفات' باب 16' آیات 12 تا 16)۔ گویا حدیث نبویؐ کا "الملحمة العظمیٰ" اور بائبل کا آرمیگاڈان ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔
>
> احادیث نبویہؐ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان جنگوں کے پہلے مرحلوں میں مقابلہ صرف عیسائیوں اور مسلمانوں کے مابین ہوگا اور یہودی اگرچہ پس پردہ تو شریک ہوں گے' لیکن سامنے نہیں آئیں گے۔ چنانچہ پچھلی خلیج کی جنگ کے دوران (موجودہ خلیجی جنگ میں بھی) اس صورت حال کی بھی ایک ابتدائی جھلک دنیا کے سامنے آ چکی ہے کہ امریکہ اور اس کے حواریوں نے اسرائیل کو جنگ میں شرکت سے روکے رکھا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود پوری کی۔ چنانچہ پہلی خلیجی جنگ کے خاتمے پر اتحادی افواج کے کمانڈر انچیف جنرل شوارز کراف نے صاف اقرار کیا کہ: "ہم نے یہ جنگ اسرائیل کے تحفظ ہی کے لئے لڑی تھی"۔
>
> تاہم جب حضرت مہدی کی قیادت اور مشرق سے آنے والی کمک کی مدد سے مسلمانانِ عرب کامیابیاں حاصل کرنا شروع کریں گے تو یہودی بھی جنگ میں کود پڑیں گے اور یہی مرحلہ "المسیح الدجال" کے خروج کا ہوگا' جس کے ہاتھوں مسلمانوں پر عذابِ الٰہی کے کچھ مزید اور شدید تر کوڑے پڑیں گے۔ تاہم اس کے بعد حضرت مسیحؑ نازل ہوں گے اور ان کے ہاتھوں نہ صرف یہ کہ دجال قتل ہوگا بلکہ پوری قوم بنی اسرائیل پر بھی اللہ کا وہ عذاب استیصال نازل ہو جائے گا جس کے مستحق وہ اب سے دو ہزار برس قبل حضرت مسیحؑ کا انکار کر کے ہو چکے تھے' اگرچہ ابتدا میں مسیح الدجال کے ہاتھوں "عظیم تر اسرائیل" وجود میں آ جائے گا' تاہم بالآخر وہی عظیم تر اسرائیل سابقہ معزول و مغضوب امت مسلمہ کا عظیم ترین قبرستان بن جائے گا۔"

Vol: 12 Regd. No. LRL- 50 No. 14
Weekly NIDA-E-KHILAFAT Lahore

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مے حیات
کہنہ ہے بزمِ کائنات، تازہ ہیں میرے واردات!
کیا نہیں اور غزنوی کارگہِ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات!
ذکرِ عرب کے سوز میں، فکرِ عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات، نے عجمی تخیلات!
قافلۂ حجاز میں ایک حسینؓ بھی نہیں
گرچہ تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات!
عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات!
صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق!
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی عشق!

Izhar (Pvt.) Limited

Engineers & Contractors

U.A.N. (Lahore /Islamabad / Karachi) 111-212-111
HEAD OFFICE: AL-HASAN, 149-Ferozepur Road, Lahore.
U.A.N. / Tel. 111-212-111, 7589269 Fax: 7565147